سلسلۂ دائرۂ حمیدیہ

(۲)

تفسیر سورۂ لہب

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

مطبوعہ معارف پریس شہر اعظم گڈھ

فہرست مضامین تفسیر سورۂ لہب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ (۱)	ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور خود ڈھ گیا،
مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ (۲)	نہ اس کا مال اُسکے کام آیا نہ اسکی کمائی،
سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ (۳)	وہ جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا،
وَّامْرَاَتُہٗ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ (۴)	اسکی بیوی بھی ایندھن ڈھوتی ہوئی
فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵)	گلے میں سن کی بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی،

پہلی آیت کی تاویل سورہ ماقبل سے تعلق اور اس حقیقت کا انکشاف

کہ

یہ بددعا نہیں بلکہ فتح مکہ کی بشارت ہے،

(۱) سورۃ الضحیٰ کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے جس طرح آنحضرت صلعم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی۔ اسی طرح آپ کے صحیفۂ نبوت کو اس فتح عظیم کے

ذکر پر ختم کیا، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا، کعبہ کے مرکز توحید و اسلام ہونے کی وجہ سے (جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں مفصل معلوم ہو چکا ہے) فتح مکہ ہی آنحضرتؐ کی بعثت کا مرکز تھی، اس کے بعد صرف بشارت و استقامت کی ضرورت تھی، اس کیلئے تین سورتیں اس کے بعد لگا دی گئیں، سورہ اخلاص، جو تمام معارف توحید کا خزانہ ہے، یہ واضح کرنے کے لئے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کی غایت توحید ہے، اور دونوں معوذتین دعاء استقامت کی تلقین کے لئے،

اس ربط کی ایک لطیف مثال اس آیت میں بھی ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ	جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ	پھر اس پر جمے رہے، ان پر ملائکہ یہ بشارت لیکر
الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا	اترتے ہیں کہ نہ خوف کرو نہ غم اور تمھارے لئے
تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ	اس بہشت کی خوشخبری ہے جس کا وعدہ
الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ	کئے جاتے تھے۔

مفصل بحث معوذتین کی تفسیر میں آئیگی، یہاں صرف اشارہ کافی ہے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تمام سورتیں (سورہ نصر، سورہ اخلاص اور معوذتین) باہمدگر مربوط ہیں، اس لئے سورہ لہب کا ان کے درمیان رکھنا کسی خاص سبب و حکمت پر مبنی ہوگا، ورنہ پورا سلسلۂ نظم درہم برہم ہو جائے گا، چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے، سورہ لہب میں اسی

کی توضیح اور بشارت ہے، گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ "اللہ نے اپنے پیغمبر کو غلبہ دیا اور اسکے دشمن کو برباد کیا" جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے،

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ — حق نمودار ہوا اور باطل مٹ گیا بلاشبہ

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — باطل مٹنے ہی کی چیز ہے،

اس نظم کی نہایت لطیف مثال آنحضرت صلعم کے اس خطبہ میں بھی ہے جو آپ نے کعبہ کے دروازہ پر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:-

لا الٰہ الا اللہ وحدہ — خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں،

صدق وعدہ ونصر عبدہ — اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد

وھزم الاحزاب وحدہ — فرمائی اور اکیلے تنہا دشمنوں کی جماعتوں کو شکست دی،

بظاہر یہ تین الگ الگ فقرے ہیں، لیکن ایک صاحب نظر کے لئے ان تینوں جملوں کے اندر علی الترتیب تین سورتوں کے مضامین پنہاں ہیں، پہلا فقرہ لا الٰہ الا اللہ وحدہ سورۂ کافرون کا مضمون ہے، دوسرا جملہ صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ سورہ نصر کے ہم معنی ہے، تیسرا ھزم الاحزاب وحدہ اور سورہ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، پس جس طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحب نظر کے لئے مربوط و منظم ہیں اسی طرح جو لوگ ان تمام سورتوں کے مضامین مجملاً پیش نظر رکھیں گے، وہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کی بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں پائینگے،

آیت تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ کی ہم نے جو تاویل کی ہے اس کی دلیل کسی قدر

محتاجِ تفصیل ہے۔

عربی زبان میں "تبت یدا" کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ مقابلہ کرنے سے عاجز ہوگیا" کیونکہ "کسر یدہ" (ہاتھ توڑ دینا) زور توڑ دینے اور عاجز کر دینے کی ایک تعبیر ہے، فتند الزمانی کا شعر ہے،

وترکنا دیار تغلب قفرا   وکسرنا من الغواۃ الجناحا

"ہم نے تغلب کی سرزمین ویران کردی، اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دئے۔"

انبیاء کے صحیفوں اور عبرانی زبان میں جو عربی کی بہن ہے، یہ اسلوب اکثر استعمال کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ایسے ہم معنی اور مرادف فقرے آئے ہیں جو اصل مفہوم پر روشنی ڈالتے ہیں صحیفۂ ذی الکفل (حزقیل) کے باب ۳۰ آیات ۲۰-۲۲ میں ہے:۔

"گیارھویں برس کے پہلے مہینہ کی ساتویں تاریخ کو یوں ہوا کہ خداوند کا کلام مجھے پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! میں نے مصر کے بادشاہ فرعون کا بازو توڑا اور دیکھ وہ باندھا نہیں جائیگا۔ دوا کی تدبیر کر کے اس پر پٹیاں کسی نہ جائیں گی کہ تلوار پکڑنے کیلئے مضبوط ہو اسلئے خداوند یہوواہ یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں مصر کے بادشاہ فرعون کا مخالف ہوں، اور اس کے بازوؤں کو اسے جو پر زور ہے اور اسے جو ٹوٹا تھا توڑونگا اور اس کے ہاتھ سے تلوار گراؤں گا۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ "مکسور الید" (شکستہ دست) سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو مقابلہ سے عاجز ہو اور تلوار اٹھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ پس آیت تبت یدا

اَبِیْ لَھَبٍ (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے) نہ تو بددعا ہے اور نہ اس میں کوئی پہلو شتم کا ہے بلکہ ابولہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیا گیا ہے، جس میں یک گونہ عزت و احترام ہے، اس لئے اس آیت کی ظاہر تاویل یہ ہے کہ یہ دشمنان خدا کے سرغنہ اور فرعون قریش کی ہلاکت کی بشارت ہے، اسی طرح مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (نہ اس کا مال کام آیا نہ اسکی کمائی) بھی ایک پیشین گوئی ہے، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی،

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے ابولہب کو اس امت کا فرعون کیوں کہا، حالانکہ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ کی مخالفت میں ابولہب کی سرگرمیاں ابوجہل اور ابوسفیان کی سرگرمیوں اور صف آرائیوں کے مقابل میں بالکل بے وزن ہیں؟ اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ خدا نے تمام دشمنوں میں سے اسی کا ذکر خاص طور پر کیا، اور دوسرے اسباب و وجوہ جو غور و فکر کے بعد سامنے آتے ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا۔

ابولہب کی خصوصیت ذکر کا پہلا سبب

۲- اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو سلطان و فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا تھا کہ آپ کی دشمنی میں سب سے زیادہ سرگرم امراء و سلاطین اور حریفانِ ملک و سلطنت ہوتے۔ آپ ایک داعی حق تھے، بشیر و نذیر تھے، اور گمراہوں کیلئے شمع ہدایت بنا کر بھیجے گئے تھے، آپ کو تلقین صبر و نماز، اعلاء کلمۂ حق، نیکی کی تعلیم اور برائی سے روکنے کا حکم ملا تھا، اور دنیا میں اس لئے تشریف لائے تھے کہ خانہ خدا کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کر دیں کہ

بانی کعبہ ابراہیم خلیلؑ سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں مفصل گذر چکا ہے،

اسی لئے آپ کو سب سے پہلے اپنے ان قرابت داروں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانے کا حکم ہوا، جو خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی تھے، ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کا طریق دعوت یہی رہا ہے، حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زجر و توبیخ کے سب سے بڑے ہدف، علماء یہود ہوئے، کیونکہ امانت الٰہی کے حامل ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے بازپرس کے مستحق وہی تھے، علماء عوام کے امام ہوتے ہیں اس لئے ہدایت و اصلاح کی دعوت سب سے پہلے انہی کو مخاطب کرتی ہے کہ ان کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ ہو۔ اگر انبیاء کرام (علیہم السلام) اپنی دعوت میں رہبرانِ قوم سے اغماض کر جاتے تو یہ دین کے معاملہ میں ناجائز چشم پوشی ہوتی اور دعوت حق کا تمام کاروبار درہم برہم ہو جاتا۔ یہ طریق دعوت باغیوں اور طالبین ملک و دولت کا ہے جو ہمیشہ عوام کو ورغلا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی مقام انبیاء کرام اور طالبین ملک و جاہ کے درمیان نقطۂ امتیاز ہے، جہاں سے دونوں جماعتوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں،

دیکھو! حضرت موسٰی علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں، فرمایا

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ	فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی
طَغٰی فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ	اور کہو کیا میں تجھے تلقین کروں کہ تو پاکی

تَزَکّٰی وَاَھْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ — حاصل کرے، اور تیرے رب کی راہ
فَتَخْشٰی (نازعات۔۱) — سوجھاؤں کہ تو اس سے ڈرے۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہِ اعظم "بنوخذ نصر" (جسکو لوگ بخت نصر کے نام سے جانتے ہیں) کو دعوت دی" یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی، اور حضرت خاتم النبیین صلعم نے متعدد سلاطین عالم کو دعوتِ اسلام کے نامے لکھے مفصل بحث کسی دوسرے مقام پر ہوگی۔

تفسیرِ سورۂ ماعون میں گذر چکا ہے کہ ابولہب خانہ کعبہ کا کلید بردار اور متولی تھا اور اس نے اس دینی ریاست سے سخت ناجائز فائدے حاصل کئے، منصب رفادہ کی بدولت اپنے گھر میں مال و دولت کا ایک بڑا خزانہ جمع کرلیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف اس کی شرک پرستی نے خانہ کعبہ کے ایک رکن اعظم توحید کو ڈھا دیا۔ دوسری طرف اس کی زر پرستی اور طمعِ مال نے اس کے اس دوسرے ستون پر بھی تیشے لگائے جو قربانی کا اصل مدعا تھا یعنی مساکین کی ہمدردی اور مہمانانِ خدا زائرین بیت اللہ کی خدمت۔ اس لئے خدا کا غضب جوش میں آیا اور بیت اللہ کی تولیت اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئی۔

پس چونکہ آنحضرت صلعم کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد کعبہ کا استخلاص اور اسکو کفر و شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنا تھا اس لئے آپنے اس خائن امانت الٰہی اور مخرب دین ابراہیمی کو جو اہمیت دی وہ قریش کے تمام ارباب منصب وجاہ میں سے

جو ندوہ، قیادت، اور اللوا، وغیرہ کے معزز منصبوں پر متمکن تھے، کسی کو نہ دی، حالانکہ ان لوگوں نے آپ کو ایذائیں دی تھیں، آپ سے جنگیں کی تھیں، اور آپ کو بیت اللہ کے جوار سے نکالا تھا، اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے منصب دینی کی وجہ سے دین الٰہی کا اصلی دشمن یہی تھا، باقی تمام قریش اس کے تابع فرمان تھا، پس جب یہ کہا گیا کہ "ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود ڈھ گیا" تو گویا یہ اعلان کر دیا گیا کہ بنیاد کفر ہل گئی اور قلعہ شرک و فساد مسمار ہو گیا۔ پس نصرت الٰہی کی بشارت کے بعد یہ پیشین گوئی مسلمانوں کے لئے دوسری بشارت عظمیٰ تھی۔

دوسرا سبب

۳۔ خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو حسن و خلق کا پیکر اور مکارم اخلاق کا معلم بنا کر بھیجا تھا، قرآن مجید میں ہے، اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "تم ایک خلق عظیم کے مالک ہو" آپ کا خود ارشاد ہے، بعثت لاتمم مکارم الاخلاق "میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں"۔

تمام مکارم اخلاق کا شیرازہ تین چیزیں ہیں، فیاضی[۱]، صلہ رحمی[۲]، اعانت ضعفاء[۳]، عرب ہمیشہ سے ان باتوں کے خوگر تھے۔ اس لئے آنحضرت صلعم نے جب لوگوں کو توحید اور ہمدردی کی دعوت دی، شرفائے عرب کی جماعت دعوت کے دوسرے جزء (ہمدردی بنی نوع) سے ذرا بھی نہ جھجکی، البتہ حمایت شرک کے جوش اور انکار معاد

نے دعوت کے پہلے جزء سے بیزار کیا اور وہ مخالفت پر کمربستہ ہوگئی، لیکن ابولہب کا حال اس کے بالکل برعکس تھا، آنحضرت صلعم کی مخالفت میں اس کی تمام سرگرمیاں حمایتِ شرک سے زیادہ اس کی زرپرستی اور حسد کا نتیجہ تھیں، یہ بات اس کی سیرت سے بالکل واضح ہے، جب قریش نے حمایت شرک اور حمیت جاہلیت کے جوش سے بے قابو ہوکر پورے خاندان بنی ہاشم کے خلاف مشہور ظالمانہ معاہدہ لکھا اور ان کے مشرک و مومن سب سے مقاطعہ کرلیا تو ابولہب نے تمام تعلقاتِ رحم و قرابت سے بے پروا ہوکر بنی ہاشم کے خلاف قریش کا ساتھ دیا حالانکہ عربوں کے نزدیک قطع رحم سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا، وہ صلہ رحم کو ہر چیز پر بالا سمجھتے تھے، اور اس کی قسم دلاکر باہم گرمدد خواہ اور طالب اعانت ہوتے تھے، سورہ نساء میں ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (نساء-۱) — پس اس خدا اور رحم سے ڈرو جن کا واسطہ دیکر باہم طالب مدد ہوتے ہو۔

یہاں تک کہ یہی چیز ان کے قانون اخلاق کی بنیاد قرار پاگئی تھی، مشہور شاعر زہیر ہرم بن سنان کی مدح میں کہتا ہے:۔

ومن ضریبته التقوی ویعصمه — من سیّئ العثرات الله والرحم

اسکی طبیعت میں تقویٰ ہے، اللہ اور رحم اسکو ظلم و معصیت کی لغزشوں سے بچاتے ہیں۔

اس کی تفصیل سورۂ نساء کی تفسیر میں گذرچکی ہے۔

ابولہب نے اس نازک وقت میں بنی ہاشم سے قطع تعلق کرکے اپنے لئے سب سے بڑی

ذلت پسند کرلی۔ اگر اس کے خون میں عربی حمیت اور شرافت نفس کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ ابوطالب کے نقش قدم پر چلتا جو اپنے آبائی دین پر قائم رہ کر آخر دم تک آنحضرت صلعم پر قربان ہوتے رہے۔ یا حضرت حمزہ رض کی تقلید کرتا جن پر صرف اس جوش غیرت نے قبول اسلام کا دروازہ کھولدیا، کہ ابوجہل نے ان کے بھتیجے کے ساتھ بدسلوکی کی۔

الغرض آنحضرت صلعم کے ساتھ ابولہب کی دشمنی اور بنی ہاشم سے کنارہ کشی کسی دینی جذبہ پر مبنی نہیں تھی۔ قریش کے لئے سب سے بڑی مذہبی جنگ بدر کا معرکہ تھا۔ اس معرکہ میں تمام سردارانِ قریش حمیت مذہب کے نشہ سے سرشار ہوکر پیغمبر اسلام کو شکست دینے کیلئے میدان جنگ میں اتر آئے لیکن ابولہب گھر میں بیٹھا رہا، (جیساکہ فصل ۸ میں معلوم ہوگا) اگر اس میں دینی غیرت کی کوئی چنگاری ہوتی تو اس موقع پر ضرور مشتعل ہوتی، اور تمام سردارانِ قریش کی طرح وہ بھی میدان جنگ میں آتا۔

ابوجہل کے جوش غیرت کا یہ عالم تھا کہ جب فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو چلایا

اللھم اقطعنا للرحم و	خداوندا! ہم میں جو سب سے زیادہ رشتۂ رحم
اتانا بما لا یعرف	کا توڑنے والا اور اس بری بات (جنگ)
فاحنہ الغداۃ	کا باعث ہوا ہو اسکو کل شکست دے۔

یہ دعا حمیت جاہلیت کے زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں ابوجہل کی شرافت نفس اور پاس رحم کا جو پہلو نمایاں ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے!

ابوسفیان پر جب تمام راہیں بند ہوگئیں، صلہ رحم کو شفیع بناکر طلب عفو کے لئے آستانۂ

نبوت پر حاضر ہوئے لیکن عز و حمیت اور جوش غیرت کا یہ حال تھا کہ دل کا بھید کھو کر میں دروغ مصلحت آمیز کا ننگ نہ گوارا کر سکے۔ توحید کا صاف اقرار کیا لیکن آنحضرت صلعم کی رسالت کے بارے میں جو تردد تھا اس کو بے دھڑک ظاہر کر دیا۔

یہ دونوں قریش کے سردار اور عرب جاہلیت کے سرخیل تھے، دیکھو! انکی ہر بات میں غیرت و حمیت کا کتنا جوش ہے۔ برعکس اس کے ابولہب کا عناد، قومی عصبیت اور مذہبی حمیت کی روح سے بالکل خالی ہے۔ پس بنی ہاشم سے کنارہ کش ہو کر اس نے جس بے غیرتی کا ثبوت دیا اس کے لئے کوئی عذر تلاش نہیں کیا جا سکتا صرف یہی کہا جا سکتا ہے، کہ وہ رفادہ کا مال خورد برد کرتا تھا اور اس پر قابض رہنے کے لئے کفار قریش کا ساتھ دینا ناگزیر تھا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اسی بات پر تعریض ہے جس کی شرح ہم آگے کریں گے۔

ابولہب کی دناءت اور زر پرستی عالم آشکارا تھی۔ چنانچہ عرب کے سب سے زیادہ معزز اور فیاض خاندان سے ہونے کے باوجود کعبہ سے سونے کے ہرن کی چوری کا الزام اسی پر لگایا گیا۔ ان باتوں سے ہمارا یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو ابوجہل کی دینی و قومی غیرت تھی کہ آنحضرت صلعم کی مخالفت اس جوش کا نتیجہ ہو، نہ اس کو ابوسفیان کی طرح سرداری حاصل تھی کہ اس کے لئے حریفانہ کاوش پیدا ہو، بلکہ اس کا تمام بغض و عناد آنحضرت صلعم کی تعلیم کی وجہ سے تھا۔ آپ فیاضی کا حکم دیتے تھے، بخل کی مذمت فرماتے تھے، یتامیٰ اور مساکین کی اعانت کی تلقین فرماتے تھے۔

غلام آزاد کرنے کا اجر و ثواب بیان فرماتے تھے، اور قحط و مصیبت کے ایام میں بنی ہاشم کی طرف سے غربا، و مساکین کو کھانا کھلانے کی جو مقدس سنت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار تھی، اس کو قائم رکھنے کی نصیحت فرماتے تھے۔ یہ تمام تعلیم تزکیۂ نفس اور ولایت بیت اللہ کے منصب عظیم کے لئے ضروری تھی، لیکن ابو لہب کے لئے اس کا ایک ایک لفظ برق خرمن سوز تھا کیونکہ ان سے اس کے بخل و خیانت کا تمام اندوختہ معرض خطر میں تھا۔ پس وہ صرف مشرک ہی نہ تھا بلکہ خیر و کرم کے تمام اخلاق حسنہ کا بھی دشمن تھا، اور جیسا کہ سورہ ہمزہ میں فرمایا گیا ہے صرف دنیا کی زندگی پر قانع ہو گیا تھا۔

ان وجوہ سے یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کا سرغنہ اور خیر و صلاح کے مخالفین کا سرخیل تھا۔ اور آپ کے سب سے زیادہ جان نثار وہ لوگ تھے جو سب سے زیادہ فیاض اور پرہیزگار تھے، اس پر مفصل بحث سورۂ واللیل کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

تیسرا سبب

۴۔ ابو لہب کے منصب اور اس کی اخلاقی دناءت سے ہم نے جو استدلال کیا ہے پچھلی دو فصلوں میں گذر چکا ہے۔ اب اسلام کی مخالفت میں اس کی پیش قدمیو کو دیکھو۔ ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ تمام اعدائے اسلام میں سے اس کا ذکر خاص طور پر کیا جائے۔

ابتدا میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت شروع کی کسی طرف

سے کوئی صدائے مخالفت نہیں اٹھی۔ آپ کی تمام پچھلی زندگی جو امانت و تقویٰ کی ایک بے مثال سیرت تھی، سب کی نگاہوں میں تھی، جس کی کشش قریب تھا کہ لوگوں کو آپ کی دعوتِ حق کی طرف کھینچ لے۔ لیکن ابولہب نے سبقت کی اور دعوت اسلام کی راہ میں ایک بھاری چٹان کی طرح جم گیا، اور اپنی فتنہ انگیزیوں سے پُر شوق دلوں کو بیزار اور راغب طبیعتوں کو نفور کر دیا۔

جب آنحضرت صلعم کو تبلیغ و دعوت کا حکم ہوا تو ایک دن آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر "یا صباحاہ" کا نعرہ لگایا۔ یہ نعرہ سن کر تمام اہل مکہ آپ کے پاس جمع ہو گئے، آپ نے فرمایا:-

انی نذیر لکم بین یدی — اے لوگو! میں تمہارے لئے ایک آنیوالے

عذاب شدید — عذاب شدید سے ڈرانے والا ہوں،

ابولہب نے جواب میں کہا:-

تبا لک الھذا دعوتنا — غارت ہو، اسی لئے تم نے ہم کو بلایا تھا،

دوسرے موقع پر اسی امر الٰہی کی تعمیل کے لئے آپ نے دعوت کا سامان کیا۔ تمام قرابت داروں کو بلایا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو آپ نے کچھ ارشاد فرمانا چاہا۔ لیکن ابولہب نے بات کاٹ دی اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:-

لقد سحرکم صاحبکم — تملوگوں پر یہ پہلے ہی سے جادو چلا رہے تھے۔

یہ سنکر لوگ منتشر ہو گئے اور آنحضرت (صلعم) کو کچھ فرمانے کا موقع نہ ملا۔

جب آنحضرت (صلعم) خاندان کے لوگوں سے مایوس ہوگئے، موسم حج میں عام قبائلِ عرب کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ اس وقت ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے ہوتا اور یہ اعلان کرتا۔

یا بنی فلان ان ھذا یدعوکم	اے بنی فلاں! یہ شخص چاہتا ہے کہ
الی ان تسلخوا اللات والعزیٰ	تم لات وعزیٰ سے برگشتہ ہوکر اور
من اعناقکم وحلفاءکم	بنی مالک ابن اقیش کے جنات حلفاء سے
من الجن من بنی مالک	قطع تعلق کرکے اسکی لائی ہوئی بدعت
ابن اقیش الی ماجاء بہ من البدعۃ	وضلالت قبول کرلو۔ پس تم اس
والضلالۃ فلاتطیعوہ	کی بات ہرگز نہ مانو۔ ......
ولاتسمعوالہ	....

وہ اسی اسلام دشمنی اور عداوت حق پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ اسی رنج وغم نے اس کو ہلاک کردیا۔ مفصل بحث تیسری آیت کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔

چوتھا سبب

۵۔ پچھلی فصلوں میں ابولہب کی خصوصیت ذکر کے وہ اسباب معلوم ہوچکے جو اس سورہ کا ربط ماقبل سورہ سے واضح کرتے ہیں نیز یہ بات معلوم ہوچکی کہ یہ بددعا اور شتم نہیں ہے۔ لیکن اس تخصیص ذکر کا ایک اور پہلو بھی ہے جس سے ایک طرف

گذشتہ مباحث کی تائید ہوتی ہے، دوسری طرف ایک جدید حقیقت روشنی میں آتی ہے۔ اس میں دشمنانِ خدا سے برأت اور سب سے کٹ کر خدائے واحد سے رشتہ جوڑنے کا مضمون پنہاں ہے۔ اس پہلو سے یہ سورہ اس اخلاص و توحید کی تمہید ہے جس کا ذکر بعد کی سورہ میں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے ان تمام کفار و مشرکین کو جو آنحضرت (صلعم) کو ایذا دینے میں سرگرم تھے، چھوڑ کر آپ کے چچا کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔ تو یہ آذر کی مثال کی طرح ایک مثال ہے تاکہ ہم کو یہ تعلیم دی جائے کہ جن کے اعمال خدا سے دور کرنے والے ہوں گے وہ نیکوں کے رشتہ اور قرابت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں تک کہ اس نبی کا رشتہ بھی کچھ سودمند نہیں ہو سکتا جو خدا کا محبوب ہے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے:-

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا	قیامت کے دن تمہارے رشتے اور
اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	تمہاری اولاد تمہارے کام نہ آئیں گی،
يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا	تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا۔
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ قَدْ كَانَتْ	اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔
لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ	تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں
وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ	کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جب
اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ	انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَ
بَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا
بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ اِلَّا قَوْلَ
اِبْرٰھِیْمَ لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ
لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ
اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ رَبَّنَا عَلَیْکَ
تَوَکَّلْنَا وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا
وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ
(سورہ ممتحنہ ۔ ۳ ۔ ۴)

اور ان سے جنکو تم خدا کے سوا پوجتے ہو
بری ہیں، ہم نے تمھارے عقیدہ اور عمل
کا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے
درمیان عداوت اور دشمنی رہے گی
برابر یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ
مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں آپ
کیلئے خدا سے مغفرت کی دعا کروں گا گو
آپکے بارہ میں مجھے خدا کی طرف سے کوئی
اختیار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر
بھروسہ کیا اور تیری طرف مائل ہوئے اور تیری ... طرف لوٹنا ہے

دوسرے مقام پر فرمایا:-

وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰھِیْمَ
لِاَبِیْہِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَۃٍ وَّ
عَدَھَآ اِیَّاہُ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗٓ
اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنْہُ
اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیْمٌ
(سورہ توبہ ۔ ۱۴)

ابراہیم کا اپنے باپ کیلئے دعاے مغفرت کرنا
محض اس وعدہ کا ایفا تھا جو اس نے اپنے
باپ سے کیا تھا پس جب اس پر یہ بات ظاہر
ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے وہ اس سے بری الذمہ
ہوگیا۔ بے شک ابراہیم نرم دل اور
بردبار تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اتمام حجت کا فرض پورے طور پر ادا کر چکنے کے بعد جس طرح حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ سے کنارہ کش ہو گئے اسی طرح اتمام دعوت اور لزوم ہجرت کے بعد پیغمبر عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے چچا کے خلاف اعلان حق کر دیا۔ ابولہب کے لئے یہ زخم نہایت کاری تھا کیونکہ یہ اعلان اس ذاتِ اقدس کی طرف سے تھا جو تمام دنیا کے لئے عموماً اور اپنے رشتہ داروں کیلئے خصوصاً سراپا مہر و محبت تھی اور جو ان کی مغفرت کیلئے اس وقت تک مشغولِ دعا رہی جب تک خدا نے اسکی ممانعت نہیں فرما دی۔

اس پہلو سے یہ سورہ ہمارے لئے خدا کی گرفت کی ایک نہایت عبرت انگیز مثال ہے کہ اگر پیغمبر عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چچا بھی نافرمانی اور سرکشی کرے تو خدائے قہار کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس سے ہم کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ تمام امر و حکم خدا کیلئے ہے، وہ عدل و حق قائم کرنے والا ہے۔ اس کی عدالت خاندان و نسب اور عزت و جاہ کے زور و اثر سے بالا ہے، اس لئے تمام سہارے جھوٹے اور تمام وسیلے باطل ہیں، اسی کا نام سہارا اور اسی کی ذات پناہ ہے بس اسی کو راضی کرنا وسیلۂ نجات ہے۔ کیونکہ کوئی سفارش بغیر اس کے اذن کے نہیں ہو سکتی۔ وہ بے نیاز اور بے ہمتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ — کہہ کہ وہ اللہ بے ہمہ ہے۔ اللہ باہمہ ہے۔
الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ — نہ وہ باپ ہے نہ وہ بیٹا ہے، نہ کوئی اسکی

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ برابری کا ہے۔

باطل پرستوں کو گمان تھا کہ خدا کے بیٹے ہیں جو اس کے بندوں کی شفاعت

کریں گے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کا یہ عقیدہ نقل کیا گیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا ہم ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ

اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر۔ ۳) ہم کو خدا سے قریب کردیں۔

خداوند تعالیٰ نے ابولہب کا انجام بیان فرما کر ان تمام باطل امیدوں

خاتمہ کر دیا۔ اس پہلو سے یہ سورہ مابعد سورہ سے مربوط ہوتی ہے۔

یہ سورہ بددعا اور ذم نہیں بلکہ پیشنگوئی اور خوشخبری ہے

۶۔ عام خیال یہ ہے کہ ابولہب نے آنحضرت (صلعم) کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

تبا لك الهذا دعوتنا ہلاک ہو۔ تم نے ہم کو اسی لئے بلایا تھا۔

اس کے جواب میں خداوند تعالیٰ نے ابولہب اور اسکی بیوی کی مذمت میں

یہ سورہ اتاری کہ آنحضرت (صلعم) کو ابولہب کی گستاخی سے جو رنج و ملال تھا وہ د

ہو جائے۔ لیکن صحیح تاویل روشن ہو جانے کے بعد کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس را

کو قبول کریں۔ اس کے وجوہ مندرجۂ ذیل ہیں۔

(۱) یہ صحیح ہے کہ ابولہب نے ذاتِ رسالت (علیہ الف الف تحیۃ) کی شان اقد

میں نہایت سفیہانہ اور گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ لیکن قرآن مجید جاہلوں سے

اور ان سے عمدہ و شائستہ لب و لہجہ میں خطاب کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ فرمایا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور ان کے ساتھ
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل ۔ ۱۲۵)	اس طریقہ سے مجادلہ کرو جو بہترین ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ	پس تم کو جس بات کا حکم ملا ہے اس کا
عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ اِنَّا كَفَیْنٰكَ	اعلان کرو اور مشرکین سے اعراض کرو۔
الْمُسْتَهْزِئِیْنَ ۵ (الحجر ۹۴-۹۵)	استہزا کرنیوالوں کیلئے تمہاری طرف سے ہم کافی ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصْفَحِ	بلا شبہ قیامت ضرور آنیوالی ہے پس
الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (الحجر ۸۵)	خوبصورتی سے درگذر کرو۔

ایک جگہ ہے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ	پس ان سے درگذر کرو اور کہو سلام
فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ	یہ عنقریب جان لیں گے۔

اسی طرح اپنے خاص بندوں کی تعریف میں فرمایا۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ	جب ان کو جاہل مخاطب کرتے ہیں
قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان ۶۳)	وہ کہتے ہیں سلام!

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے باپ کے مکالمے میں ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ	کہا اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں
اٰلِهَتِیْ یٰاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ	سے برگشتہ ہو؟ اگر تم اس سے باز
لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ	نہ آئے تو میں تم کو سنگسار کردوں گا
وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا قَالَ	اور تم میرے سامنے سے دور رہو۔ ابراہیم
سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ	نے جواب دیا سلام علیک! میں آپ
لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا	کے لئے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کرونگا،
(مریم-۴۶، ۴۷)	وہ میری بڑی خبر رکھنے والا ہے۔

آنحضرت صلعم کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم ہوا تھا۔ آپ ان کے تمام خصائل و خصائص کے وارث تھے اور منکرینِ حق کی دلآزاریوں اور بدزبانیوں پر آپ کو صبر کی تعلیم فرمائی گئی تھی۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ	ان کی باتوں پر صبر کرو، اور ان کو
وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (مزمل-۱۰)	خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔

(۲) پھر اگر منشار الٰہی یہی تھا کہ ابولہب کی مذمت کر کے آنحضرت صلعم کا غصہ و ملال دور کیا جائے تو آپ کو کفار کا مثلہ کرنے سے کیوں روکا گیا؟ حالانکہ انھوں نے آپ کے جان نثار رضاعی بھائی اور محبوب چچا حضرت حمزہؓ کے جسمِ اقدس کا مثلہ کر کے آپ کو انتہائی صدمہ پہنچایا تھا۔

(۳) اگر پیغمبرِ عالم (صلعم) اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے تو انکے جان نثاروں کی بے پناہ تلواروں سے اہلِ مکہ کو کون پناہ دے سکتا تھا؟ حالانکہ انھوں نے ان سب کے لئے امن عام کی منادی کر دی اور ادنیٰ ایذا رسانی بھی گوارانہ فرمائی۔ بلاشبہ آپ نے ظالموں اور عہد شکنوں کے خلاف جہاد کیا۔ لیکن یہ کوئی انتقامی کارروائی نہ تھی۔ اس کا مقصود قیام عدل تھا کہ خدا کی زمین شر و فساد سے پاک ہوجائے۔ آپ کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس کو ذاتی انتقام کی مثال میں پیش کیا جا سکے۔ آپ نے ہمیشہ سختی کا جواب نرمی اور بدسلوکی کا جواب لطف و محبت سے دیا۔ یہ آپ کے خلقِ عظیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔

(۴) اگر خدا و رسول کسی خاص کافر کی مذمت و شتم ہی پر اتر آتے تو اس کے سب سے زیادہ مستحق ابوجہل اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تھے۔

(۵) قرآن مجید میں کفار کی مذمت ہمیشہ بطریق کنایہ کی جاتی ہے تعیین و تشخیص اس کا اسلوب کلام نہیں۔ وہ مطلق طور پر صفات ذمیمہ کی مذمت کرتا ہے۔

(۶) اسی اصول پر آنحضرت (صلعم) بھی ہمیشہ بطریق تعریض مذمت فرماتے تھے۔ مثلاً ما بال قوم یفعلون کذا و کذا۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسا ایسا کرتے ہیں۔

(۷) کتبِ سابقہ میں آنحضرت (صلعم) کی تعریف آئی ہے۔ کہ تو سخت کلام نہ ہوگا۔

مجھے خیال آتا ہے کہ شاید یہ چیز آنحضرت صلعم) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بطور ایک علامت فارقہ کے بتلائی گئی ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے کلام میں شتم کی مثالیں بہت ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ نصاریٰ کی تحریف ہو اور یہی پہلو راجح ہے۔

متی باب ۱۲ آیت ۳۴ میں ہے:-

"اے سانپ کے بچو! تم برے ہو، کیونکر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو"

مرقس باب ۱۲ آیت ۳۳ میں ان کے افضل ترین خلیفہ شمعون صفا کے متعلق یہ فقرہ ہے:-

"پطرس (صفا) کو ملامت کیا اور کہا اے شیطان! میرے سامنے سے دور ہو"

اس کی مثالیں انجیل میں بہت ہیں۔

آنحضرت صلعم کی نسبت معلوم ہے کہ آپ نہایت باحیا اور پاکیزہ کلام تھے۔ اس لئے آپ کے اخلاق اور آپ کی شان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زبان سے جو کچھ نکلے وہ پاکیزگی اور لطافت کا نمونہ ہو۔

(۹) لسان الٰہی نے نام لیکر اس کی بھی مذمت نہیں کی، جو عزت و شرف کے لحاظ سے تمام کفار کا سرخیل تھا۔ جس کی قیادت میں ان کی فوجیں صف آرا ہوتی تھیں۔ جو قبائل کا سردار، اور جماعتوں کا لیڈر تھا۔ اور جس کی آتش بیانی دلوں کے اندر طوفان برپا کر دیتی تھی، پھر وہ ایک ارذل ترین خلائق کے ذم و شتم سے آلودہ ہونا کیونکر گوارا کرتی؟

(۱۰) لیکن ان سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تاویل سورہ کے محل و مقام کے لحاظ سے بالکل نامناسب اور بے ربط ہے۔ ماقبل سورہ میں فتح مکہ اور استغفار و تسبیح کا ذکر ہے۔

ما بعد سورہ میں توحید کامل کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان دو عظیم الشان مسئلوں کے بیچ میں
ی کا کیا موقع تھا؟ ان تمام مذکورۂ بالا وجوہ میں سے ہر وجہ اس تاویل کے قبول کرنے
ے مانع ہے۔

تاویل میں غلط فہمی کے اسباب

۷۔ اس سورہ کو ذم و شتم یا بددعا کے معنی میں لینے کے بظاہر صرف چار اسباب
ں اور سب ضعیف اور ناقابل اعتنا، لیکن ہم ان کو بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں،
ہ ایک طرف ارباب تاویل کا عذر واضح ہو جائے، دوسری طرف اس کے اسقام
امنے آجائیں۔

(۱) ابو لہب نے آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے کہا تباً لک۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو
یسا ہی جواب دیا۔ اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے۔

(۲) ماضی کا صیغہ یا تو خبر کے لئے آتا ہے یا انشاء کے لئے۔ چونکہ یہ سورہ ابو لہب کی
لکت سے پہلے نازل ہوئی ہے اس لئے یہاں صیغہ ماضی بمعنی انشا، لعنت
ے لئے ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "تربت یداہ۔ شلت یمینہ۔" اس کے ہاتھ
اک آلودہ ہوں۔ اس کے ہاتھ شل ہو جائیں"۔

اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ ماضی کا صیغہ اصلاً خبر کے لئے ہے اور بعض
وقات خبر ایسے واقعات کی دی جاتی ہے جو واقع ہونے والے ہوتے ہیں۔ یہ ایک

طرح کی پیشینگوئی ہوتی ہے جو لوگ صحف سماوی اور قرآن مجید کی پیشینگوئیوں کے اسلوب سے آشنا ہیں ان کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی کہ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ایک واقع ہونے والے امر کا اعلان ہے۔

قرآن مجید میں ہے،

أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا پس اس کی جلدی نہ کرو۔

یوحنا نے اپنے مکاشفات میں کہا:۔

"عظیم الشان بابل ڈھ گیا"

حالانکہ یہ قول بابل ڈھنے سے پہلے کا ہے۔

بعد کی آیت سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ کا خبر ہونا قطعی ہے۔ اس لئے اس کا اقتضاء بھی یہی ہے کہ پہلی آیت خبر ہو متصل آیت "مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ" پیشینگوئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ سابق سورہ کے متعلق اتفاق رائے ہے کہ اس میں خبر دی گئی ہے، ہمارے نزدیک یہ سورہ بھی اسی کے مشابہ ہے۔

(۳) تیسری مقبول عام وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اس جملہ کو تربت یدا ہ کے مفہوم میں لیا۔ حالانکہ محض یہ بات ان کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں، کیونکہ دعا کے لئے مخصوص صیغے ہوتے ہیں۔ اور تباب سے دعا کے لئے صرف تبًّا کا لفظ مستعمل ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کے دوسرے مشتق بھی دعا میں مستعمل ہیں جب بھی وہی تاویل صحیح ہوگی جو سیاق وسباق سے اشبہ، صاف

اور خوبصورت ہو۔

(۴) چوتھی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ منصوب للذم ہے۔ حالانکہ اس کے منصوب ہونے کی علت ذم کو قرار دینا نہایت کمزور تاویل ہے صحیح یہ ہے کہ حمال واقع ہے فصل ۹ میں اس کا مفصل بیان آئے گا۔

دوسری آیت کی تاویل اور پیشنگوئی کی صداقت

۸۔ جہاں تک تاویل کا تعلق ہے، یہ واضح ہو چکا کہ یہ سورہ، سورۂ سابقہ کی طرح خبر یا پیشنگوئی ہے، اب تاریخ کی روشنی میں دیکھو یہ پیشنگوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔

بدر کا معرکہ تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ عظیم الشان معرکہ ہے، خدا نے اس کو "یوم الفرقان" کہا۔ اور پیغمبر (صلعم) سے فتح و نصرت اور اس کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کا جو وعدہ فرمایا تھا اسی دن پورا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن دعا فرمائی "اللھم انجزلی ما وعدتنی" خداوندا، تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے، پورا کر"۔ خدا نے آپ کو تمام سرداران قریش کی قتل گاہیں دکھائیں اور آپ نے اپنے صحابہؓ کو ایک ایک کی قتل گاہ دکھائی۔

اس لڑائی کے لئے قریش کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے پوری طاقت میدانِ جنگ میں ڈال دی۔ ان کا ایک ایک بچہ نشۂ جنگ سے سرشار تھا۔

حضرت عباسؓ کو ایک حد تک آنحضرت صلعم سے محبت تھی تاہم جوشِ عام کا سیلاب ان کو بھی میدان جنگ میں کھینچ لایا۔ لیکن ابو لہب اس تاریخی معرکہ میں شریک نہ ہوا، اس نے اپنی جگہ عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا، عاص پر ابو لہب کے چار ہزار درہم قرض تھے، وہ تنگدستی کی وجہ سے قرض ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ ابو لہب نے روپیہ ڈوب جانیکے اندیشہ سے سنگدل بخیلوں کے عام اصول کے مطابق، عاص کی جان اس کے عوض خریدلی۔ اور اپنا قائم مقام بناکر بدر کے میدان میں بھیجا۔

عرب ناموس کی حفاظت کے لئے مال و دولت کو ڈھال خیال کرتے تھے، ابو لہب نے بھی یہ ڈھال استعمال کی اور چاہا کہ اس ایک ہی سپر سے ناموس اور جان دونوں کو بچالے جائے۔ لیکن ائمۂ کفر کے لئے خدا کا جو فیصلہ ہوچکا تھا وہ ابو لہب پر پورا ہوا۔ معرکۂ بدر کے ساتویں دن وہ چیچک (عدسہ) میں مبتلا ہوا۔ اور اسی میں ہلاک ہوگیا۔ اس کے دونوں بیٹوں نے چھوت لگ جانے کے خوف سے دو تین دن تک اس کی لاش گھر ہی میں پڑی رہنے دی۔ یہاں تک کہ تمام جسم سڑگیا۔ ایک شخص کے غیرت دلانے پر ان کو خیال ہوا کہ دفن کردیں۔ دور ہی سے جسم پر کچھ پانی ڈالا، پھر مکہ کے بالائی حصہ میں لے گئے اور ایک دیوار کے پاس رکھ کر دور ہی سے پتھر وغیرہ پھینک کر لاش ڈھانک دی۔

اس جگہ یہ بات لحاظ رکھنی چاہئے کہ پتھر مارنا لعنت ہے۔ جیسا کہ ہم سورہ فیل کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں۔

اب غور کرو لسانِ غیب نے جو پیشنگوئی کی تھی وہ کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔

۱۔ ابولہب مقابلہ کرنے سے عاجز رہا۔ اس نے اپنی تلوار نہیں اٹھائی، اور میدان
ــک میں آنے سے گریز کیا۔

۲۔ اس کے اکثر اعوان قتل ہوئے، اگر اشارات فہم حقیقت کیلئے کافی ہیں
ـیدایں کی یہ تاویل نہایت صاف ہے۔ عرب اعوان و انصار کو ید کہتے ہیں۔
ـضرت صلعم کا ارشاد ہے (وھم ید علی من سواھم) باقی علم وعمل کے ہاتھ جیساکہ
ـض لوگوں نے کہا ہے۔ لغت کے خلاف اور محض تفسیر بالرائے ہے۔

۳۔ ابولہب کا مال اس کے کام نہ آیا۔ کیونکہ اس نے ایک شخص کو میدان
ــک میں جانے کے لئے خریدا تاکہ اپنی جان بچالے جائے۔ لیکن وہ اپنے کو موت
ـسے بچا نہ سکا۔

۴۔ قوت وشوکت کی بربادی کے ساتھ وہ خود بھی ہلاک ہوگیا۔

۵۔ ماکسب سے حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس کے بیٹے مراد ہیں۔
ـیہ روایت صحیح ہے تو بلحاظ تاویل اس میں کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ حقیقی معنی کی رعایت
ـساتھ کسی لفظ کی وسعت، ان تمام معانی کا احتوا کرسکتی ہے جو اس کے دائرے میں
ـلیں۔ بہرحال اگر "ماکسب" سے اس کے بیٹے مراد ہیں تو تاریخ سے ثابت ہے کہ
ـلہب کے بیٹے اس کے کام نہ آئے، کیونکہ اس کی آخری مصیبت میں انھوں نے اسکو
ـڑدیا۔ دوسرا پہلو یہ ہوسکتا ہے کہ ماکسب سے اس کی وہ کمائی مراد لیجائے جو حرام وحلال

ہر راہ سے، اس نے جمع کی تھی۔

ان دونوں تاویلوں میں سے جو تاویل بھی اختیار کی جائے، دونوں صورتوں میں ربط کا پہلو ایک ہی ہے، وہ یہ کہ جس چیز نے اس کو بخل وخیانت پر آمادہ کیا وہ چیز اس کے کام نہ آئی۔ انسان کے دین وتقویٰ کے لئے سب سے بڑا فتنہ مال ودولت اور اہل وعیال ہیں۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۶۴-۱۵ تمھارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ تمھاری ازواج اور تمھاری اولاد میں

عَدُوًّا لَّكُمْ (۶۴-۱۴) تمھارے دشمن ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل صاف ہے۔ جمع مال میں مردوں کا غیر معتدل انہماک زیادہ تر عورتوں کی آرایش پسندی اور فرمایشوں کی تعمیل کے لئے ہوتا ہے جس کا نتیجہ دونوں کی بربادی ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد تاویل یہ ہوگی کہ جن چیزوں کو اس نے قوت وعزت خیال کیا یعنی مال واولاد، انھوں نے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچایا قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی زبانی کہا گیا:۔

مَآ اَغْنٰى عَنِّىْ مَالِيَهْ هَلَكَ میرا مال میرے کام نہ آیا۔ میری طاقت

عَنِّىْ سُلْطَانِيَهْ (۶۹-۲۸،۲۹) میرے ہاتھوں سے چھن گئی۔

مال او اہل وعیال کے عشق نے حرص اور خیانت پر آمادہ کیا، لیکن خدا کی گرفت

کے وقت یہ کچھ کام نہ آئے۔ تاویل کا یہ پہلو اس آیت کا تعلق بعد کی آیت سے واضح کرتا ہے۔

یہاں تک پہلی اور دوسری آیت کی تاویل سے متعلق جتنی ضروری باتیں تھیں بیان کی گئیں۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ گیا کہ ابولہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیوں ہوا؟ آئندہ فصل میں اس سوال کا جواب ہے۔

تیسری آیت کی تاویل اور عمل و جزا کی مشابہت

۹۔ خداوند تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ اس مسجد کی حرمت برباد کریں گے، جس کا نام اس نے بیت محرم رکھا ہے، وہ ہلاک ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۲-۲۵)

اسکا یہ فیصلہ ہمیشہ پورا ہوا۔ اس نے خائنوں اور غداروں کا اقتدار بیت اللہ پر کبھی قائم نہیں رہنے دیا۔ اس کی تفصیل سورۂ ماعون کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔ اسی اصول کے مطابق خداوند تعالیٰ نے اس خائن کی ہلاکت کی خبر کے بعد اس کے انجام کی خبر دی۔ جس سے وہ اس عذاب دنیاوی کے بعد دوچار ہوگا۔ فرمایا:۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وہ جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان آخرت میں اپنے عمل کے مناسب جزا پائے گا۔ بلکہ خود اس کا عمل ہی اس کی جزا رہوگا۔ جو اس نے بویا ہے وہی کاٹیگا۔ اور جو لگایا ہے اسی کا پھل کھائے گا۔ جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے:

إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۶۶-۷) — تم جو کرتے تھے وہی بدلہ میں پا رہے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:-

ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ — جو تم نے کمایا ہے وہ چکھو۔

اس اصل کو پیش نظر رکھکر اگر اس کے حالات اور اس جزا پر غور کرو گے جو خدا نے ذکر کیا ہے تو دونوں میں نہایت واضح مناسبت پاؤ گے۔

یہ معلوم ہے کہ وہ نہایت تند مزاج اور شعلہ رو تھا۔ اسی وجہ سے اس کی کنیت "ابو لہب" ہوئی اور اس قدر مشہور ہوئی کہ اس کا اصلی نام "عبد العزیٰ" بالکل غائب ہو گیا۔ اگر یہ شخص عقلمند ہوتا، اپنے اندر حلم و کرم اور محبت و ہمدردی کے جذبات پیدا کرتا، اپنے نفس کو قابو میں کرتا اور تند مزاجی و طماعی کی خباثت کی جگہ عزت و شرف کے حصول کی کوشش کرتا۔ سموءل کا شعر ہے۔

وان هو لم يحمل على النفس ضيمها   فليس الى حسن الثناء سبيل

اگر وہ اپنے نفس کو اس چیز پر مجبور کریگا جس سے وہ بھاگتا ہے تو پھر مدح و ستایش کے حصول کا کوئی راستہ نہیں۔

خنساء کا شعر ہے:-

نهين النفوس وهون النفوس   عند الشدائد ابقى لها

ہم مصائب کے وقت اپنی جانوں کو نہایت حقیر سمجھتے ہیں اور ایسے اوقات میں انکو حقیر سمجھنا ہی انکی اصلی زندگی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نفس کا شرف یہ ہے کہ مصائب کو جھیلے اور ناگوار کو گوارا

یہی انسان کی اصلی آزمایش ہے۔ ابولہب اس آزمایش میں ناکام رہا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے مشتعل اور مغرور نفس کی اصلاح کرتا اس نے اپنی حرص و طمع اور حسد و عداوت کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی۔

یہ محض باطل خیال آرائی نہیں ہے بلکہ عرب و عجم سب ان بری عادتوں کو آگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان عادتوں کو آگ سے کوئی حسی مناسبت نہیں ہے اس لیے لازماً یہ تشبیہ ان کے اثر کو پیش نظر رکھ کر اختیار کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشابہت عام عقل انسانی کے نزدیک نہایت واضح ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ وہ عموماً ثواب و عقاب کو ایسی صورت میں بیان کرتا ہے جس کو اعمال سے مناسبت ہوتی ہے۔ اس سے بعض اہم حقائق کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ جو لوگ اس پہلو سے قرآن مجید پر غور کریں گے ان پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ شہوات اور ان کے اثر کو آگ سے بہت زیادہ مشابہت ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ہم میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ جزا، درحقیقت عمل کا مثل اور اس کا ثمرہ ہے۔ اس سے کمال عدل الٰہی پر ہمارا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسماے الٰہی میں سے الحق المبین اور خیر الحاکمین کی معرفت بڑھتی ہے؛ اور یہ یقین محکم ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ   اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔

شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰-۴۴) بلکہ لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

....

اس آیت پر اگر ہم جزاء اور عمل کی مشابہت کے پہلو سے غور کریں گے تو اس سے ہمارے گذشتہ مباحث کی تائید ہوگی اور ابولہب کے اعمال اور اس کے حالات کی مطابقت بالکل واضح ہو جائے گی۔ پس ہمارے نزدیک سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا) ایک ایسے واقعہ کی خبر ہے جو حرف بحرف پورا ہوگا اور جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔

چوتھی آیت کی تاویل

۱۰ چوتھی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابولہب کی بیوی بھڑکتی آگ میں پڑے گی اور اس وقت اس کی حالت ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دنیا میں ایندھن ڈھوتی تھی۔ یہ تاویل بعید بلکہ غلط ہے۔ دلائل کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ لفظ حمالۃ منصوب ہے۔ تمام امت اس قرأت پر متفق ہے۔ قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ متواتر اور محفوظ قرأت کے ہوتے ہوئے شاذ قرأت اختیار کرنا جائز نہیں۔ ہم قراء کے اختلاف کے منکر نہیں ہیں بشرطیکہ یہ معانی کے اختلاف تک منجر نہ ہو۔ اس سے ان کا مقصود تفسیر اور اصل مطلب کو

مخاطب کے ذہن سے قریب تر کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے حمالۃ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے طریقہ سے وہی مطلب سمجھانا چاہتے ہیں۔ جو نصب والی قرأت سے مقصود ہے ہم دونوں طریقوں سے اسکی تفسیر کرتے ہیں۔

نصب والی قرأت کی صورت میں وَامْرَأَتُهُ میں جو "و" ہے وہ عطف کے لئے ہے۔ یعنی "اس کی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ بھڑکتی آگ میں پڑے گی"۔ یہ مطلب بالکل واضح ہے۔ سیاق کلام اسی کا مقتضی ہے۔ یہاں دونوں کا آگ میں داخل ہونا بیان کیا گیا ہے، اور نص سے جو مفہوم واضح ہوتا ہے اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے، اس صورت میں حمالۃ کا نصب حالیت کی وجہ سے ہوگا،

سیبویہؒ نے لکھا ہے کہ

بلغنا ان بعضهم قرأهذا	بعض لوگوں نے "حمالۃ الحطب"
الحرف نصبا وامرأته	کو منصوب پڑھا ہے۔ ان لوگوں
حمالة الحطب ولكنه	نے گویا ذم و شتم کے لئے لفظ
كانه قال اذكر حمالة	"اذکر" مقدر مانا ہے۔۔۔۔۔
الحطب شتما لها	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سیبویہؒ کے نزدیک مختار قرأت رفع کی ہے لیکن جو لوگ منصوب پڑھتے ہیں ان کا مقصود سیبویہؒ کے خیال میں گویا یہ ہوگا۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم آگے بتائیں گے کہ رفع والی قرأت کی صورت میں آیت کی تاویل کیا ہوگی۔

صاحبِ کشاف نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ سیبویہ کے فریب میں آگئے ان کی طبیعت بہت نادر پسند ہے۔ ہمارے نزدیک انکا ذوق بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ اس تاویل کو انھوں نے محض اس لئے اختیار کر لیا ہے کہ اس میں ذم و شتم کا پہلو نمایاں ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

وانا استحب هذه القرأة	میں اس قرأت کو ترجیح دیتا ہوں
وقد توسل الی رسول الله	اور جس نے ام جمیل (ابو لہب کی بیوی)
صلی الله علیه وسلم بالجمیل	کو گالی دینا پسند کیا اس نے رسول اللہ
من احب شتم ام جمیل	تک نیک عمل کا وسیلہ پیدا کیا۔

اس سادگی پر غور کرو! ایک سخیف اور مہمل قول کو محض ایک لفظی صنعت کی بنا پر اختیار کر لیتے ہیں۔ بہرحال یہ سخیف قول ذرا بھی قابلِ اعتنا نہیں۔

ہم چھٹی فصل میں دلائل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہاں ذم و شتم کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اگلی سطروں میں یہ بات بھی واضح ہو جائیگی کہ اس کا حالیت کی وجہ سے منصوب ہونا موقع اور نظم کے اعتبار سے اقرب اور تاویل کے اعتبار سے احسن ہے۔ اسلئے کچھ ضرور نہیں کہ اعراب کا ایک نادر پہلو پیدا کیا جائے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ یصلیٰ نارًا ذات لهب میں "یصلیٰ" کا جو فاعل ہے "حمالة" اسی سے حال پڑا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ حالت اس کی اس وقت ہو گی جب وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گی۔

رفع والی قرأت کی شکل میں "حمالة"، "وامرأته" کی خبر پڑے گا، جیسا کہ سیبؔو کے قول سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور "و" اس صورت میں حالیہ ہوگا یعنی ابولہب بھڑکتی آگ میں پڑے گا اور حال یہ ہوگا کہ اس کی بیوی ایندھن ڈھونے والی ہوگی اور اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی"۔ پس جو لوگ حمالة کو رفع کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ درحقیقت اس مفہوم کی تفسیر کرتے ہیں جو نصب والی قرأت میں ہے تاکہ کسی کو ذم و شتم کا گمان

اس صورت میں "و" کا عطف کیلئے ہونا بوجوہ ذیل صحیح نہیں ہوسکتا۔

۱۔ یہ حالت اس کی دنیا میں نہیں تھی تفصیل بعد میں آئے گی۔

۲۔ معطوف اور معطوف علیہ میں بعد ہو جائے گا۔

۳۔ دونوں خبروں "حمالة الحطب" اور "فی جیدها حبل من مسد" کا نظم درہم برہم ہو جائے گا۔

صفت قرار دیکر رفع پڑھنے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے۔ کیونکہ حمالة الحطب نکرہ ہے۔ اس میں اسم مبالغہ اپنے معمول کی طرف مضاف ہوگیا ہے۔ یہ بہرصورت اضافت لفظی ہے جو مضاف کو معرفہ نہیں بنا سکتی۔

مبتدا کو محذوف قرار دیکر اس کو خبر پڑھنا یعنی ھی حمالة الحطب سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ حذف خلاف اصل ہے۔ نیز اس شکل میں بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ اس کی دنیا کی حالت کا بیان ہے، اس لئے بات ویسی ہی مبہم رہ گئی۔ غرض دونوں قرأتوں کا ماحصل یہی ہے کہ یہ اس کی آخرت کی حالت کا بیان ہے۔

۲۔ بعد والی آیت میں جیسا کہ ظاہر ہے اس کی روز قیامت کی حالت کا بیان ہے اس بات پر تمام مفسرین متفق ہیں۔ اس میں اسی وصف کا تتمہ ہے جو حمالۃ الحطب میں مذکور ہے، جیسا کہ آگے چلکر آیت کی تاویل سے واضح ہوگا۔ اس لئے لازمی طور پر ان دونوں کو ایک زمانہ میں ماننا پڑے گا۔

ایک شاعر کہتا ہے :۔

امشی الی الھیجا ء صبحا　　متقلدا سیفا و رمحا

میں صبح کو لڑائی کے لئے نکلتا ہوں، تلوار اور نیزہ لے کر۔

اس میں دونوں حالتوں کو دو زمانوں میں نہیں قرار دے سکتے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قریش کا رتبہ اس سے بہت برتر تھا کہ انکی عورتیں لکڑ اور ایندھن ڈھوئیں۔ جن کو عرب کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے، وہ جانتے ہیں عرب کی عنان حکومت قریش کے ہاتھ میں تھی خصوصاً بنی ہاشم تو گویا عرب کے سرتاج تھے ان کے شرف اور احساس شرف کا یہ حال تھا کہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کیلئے دوسرے قبیلوں کی دائیاں رکھتے تھے کہ یہ کام تکلیف دہ ہونے کے علاوہ ان کی عورتوں کے خلاف شان تھا۔ کیا ان کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی عورتوں سے ایندھن ڈھلوائیں گے جو مخصوص لونڈیوں کا پیشہ تھا۔؟

چنانچہ نابغہ کہتا ہے :۔

تحید عن استن سود اسافلہ　　مشی الاماء الغوادی تحمل الحزما

وہ اونٹنی استن کے ان درختوں سے بدکتی ہے جن کے تنے سیاہ ہیں اور جو ان لونڈیوں کی طرح چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو صبح کے وقت لکڑیوں کے گٹھڑے کر نکلتی ہیں۔

مہلہل کا شعر ہے:۔

لم ادع غیر اکلب ونساء　　واماء حواطب وعیال

میں نے (قبیلہ بنی بکر میں) بھونکنے والے کتوں، ماتم کرنیوالی عورتوں، ایندھن ڈھونیوالی لونڈیوں اور بچوں کے سوا کسی کو نہ چھوڑا

قیس بن حطیم اوسی کا شعر ہے:۔

اصاب سریح القوم غرب سیوفنا　　وغادرن ابناء الاماء الحواطب

ہماری تلواروں نے حریفوں کے تمام شرفاء کا خاتمہ کر دیا۔ صرف ایندھن ڈھونیوالی لونڈیوں کی اولادیں بچ رہی ہیں۔

اخنس بن شہاب تغلبی لکھتا ہے:۔

یظل بھاربد النعام کانھا　　اماء تزجی بالعشی حواطب

ان منزلوں میں خاکی رنگ کے شتر مرغ ایسے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے شام کو ایندھن ڈھونیوالی لونڈیاں ہانکی ہوئی آتی ہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں نے اسی استبعاد کی وجہ سے ایک دوسرا مذہب اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ابولہب کی بیوی چغل خور تھی، اور اسی بری عادت کو "حمالۃ الحطب" سے بطریق کنایہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ یہ عرب کے ایک شریف ترین خاندان کی عورت ہے۔ یہ ام جمیل بنت حرب، خاندان بنی عبد شمس کی ایک باعزت خاتون ہے جو ہاشمی خاندان میں بیاہی گئی ہے، یہ ایندھن ڈھونے والی لونڈی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انھوں نے تاویل کا ایک دوسرا پہلو اختیار کیا۔ لیکن جب کلام کو حسن تاویل کے ساتھ ظاہر پر محمول کرنا ممکن ہو تو مجازی معنی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

پھر ضروری ہے کہ قرآن مجید کی تاویل میں قدیم کلام عرب کی پیروی کیجائے

اور ان کے قدیم کلام کا جو حصہ ہمارے پاس محفوظ ہے اسکے پورے دفتر میں اس مجاز کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے بعض لوگوں نے ابن الاسلت کے اس شعر سے استدلال کیا ہے۔

ونبئتکم شی جین کل قبیلة   ھازمل من بین مالک وحاطب

لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے، عرب لڑائی کی آگ بھڑکانے کیلئے چغلی کا ذکر نہیں کرتے۔ ایسے مواقع پر اسلحہ، گھوڑوں اور شہسواروں کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ بشامہ بن عمرو مری لکھتا ہے :۔

وحشوا الحرب ذا اوقدت   رماحا طوالا وخیلا فحولا

ومن نسج داؤد موضونة   تری للقواضب فیھا صلیلا

جب لڑائی کی آگ بھڑکائی جائے تو اس کیلئے لمبے نیزے اور سوماشہ سواروں کا ایندھن فراہم کرو، اور داؤدی بناوٹ کی ملی ہوئی کڑیوں والی زرہیں جن پر تلواروں کے پڑنے سے جھنکار سنائی دے،

عمرو بن اطنابہ خزرجی کہتا ہے :۔

لیسوا بانکاس ولا میل ذا   ما الحرب شبت شعلوا بالشاعل

وہ کمینے اور بودے نہیں ہیں جب لڑائی کی آگ بھڑکتی ہے تو اسکو بھڑکانیوالے نوجوانوں کے ذریعہ تیز کردیتے ہیں

اس مجاز کی تائید میں صاحب لسان العرب نے بھی ایک شعر نقل کیا ہے۔

من البیض لم تصطد علی ظھر لامة   ولم تمش بین الحی بالحطب الرطب

وہ گوری چٹی ہے کبھی کسی قابل الزام کام میں نہیں پکڑی گئی اور قبیلہ میں چغلخوری اس کا شیوہ نہیں

لیکن یہ استدلال بھی چنداں قابل اعتنا نہیں ہے، اولاً تو صاحب لسان العرب نے

شاعر کا نام نہیں بتایا۔ اور مجہول شاعر کی سند خصوصاً تاویلِ قرآن میں کسی طرح مستند نہیں ہو سکتی۔ اس اصول پر تمام علما متفق ہیں۔ ثانیاً شعر میں یہ استعارہ قرینہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس کے بغیر یہ مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسی طرح بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ کے راستہ میں کانٹے بچھاتی تھی اس لئے اس کو "حمالۃ الحطب" کہا گیا۔ ابن جریر کا یہی مذہب ہے۔ لیکن یہ تاویل بھی بہت بعید از قیاس ہے۔ راستہ میں کانٹے بچھانے والے کو "حامل الحطب" کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، نیز راستہ کے کانٹوں سے ہر شخص کو اذیت پہنچے گی۔ یہ صرف آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ ہی کے لئے مخصوص نہیں ہو سکتی۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ایندھن ڈھونا مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی عیب کی بات نہیں ہے، پھر قرآن مجید نے اس کا عیب کی حیثیت سے کیوں ذکر کیا؟ یہ بات قرآن مجید کی شان سے نہایت بعید ہے۔ اس نے دشمنانِ خدا کے بہت سے عیوب کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہ وہی باتیں ہیں جو عقل و تقویٰ کے اعتبار سے عیب ہیں۔ صرف ایک جگہ سورۂ ن میں "زنیم" (خارجی) کا جو لفظ استعمال کیا ہے لیکن، جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل سے بتلا چکے ہیں، اس سے محض اس کی تملق اور چاپلوسی کی عادت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

یہ دلائل ہم نے بطور تمہید کے اس لئے بیان کیے ہیں کہ اس آیت میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہے، اور جس کا ذکر ہم آگے کریں گے، وہ ان شکوک میں گم نہ ہو جائے، استدلال کے لئے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد چیز معنی اور نظم کا حسن ہے۔

ابولہب کی بیوی کا ذکر کیوں کیا گیا

(۱۱) چھٹی فصل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کسی خاص عورت کو، اس بنا پر کہ اس نے پیغمبر عالم صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو ایذا دی ہے، گالی دینے اور مذمت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر قرآن مجید اس بات پر اتر آتا، حالانکہ وہ اس سے پاک ہے، تو اس کی گالی اور مذمت کی سب سے زیادہ مستحق وہ یہودیہ تھی جس نے آنحضرت صلعم کے کھانے میں زہر ملایا تھا۔ جن اشقیاء نے نہایت بیدردی کے ساتھ آپ کو طائف سے نکالا، آپ نے ان کی بھی بجز اپنے پروردگار کے کسی سے شکایت نہیں کی، اور یہ شکایت بھی جن الفاظ میں فرمائی ان کی شیرینی اور لطافت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کا شب و روز کا مشغلہ ذات رسالت کی توہین تھا، اس لئے وہ سب سے زیادہ ذم و شتم کے مستحق تھے لیکن شیریں کلامی اللہ اور اس کے رسول کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے۔ اب غور کرو کہ جب قرآن نے ان مردوں میں سے کسی کو گالی نہیں دی تو ان کی عورتوں میں سے کسی کو گالی دینے کا کب روادار ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ خیال نہایت مہمل ہے تفصیل پہلے گذر چکی ہے، اب اصل مسئلہ پر غور کرنا چاہیے کہ اس عورت کے ذکر کرنے میں کیا خاص حکمت ہے؟ خدا نے قرآن کو کتاب حکیم کہا ہے پس انسان کی اصلی طلب و جستجو یہ ہونی چاہیے کہ اس میں حکمت تلاش کرے۔

خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض قوموں اور بعض افراد کا ذکر شر اور خیر کی مثال کی حیثیت سے کیا ہے، تاکہ ان کو خدا کی جو نعمت و نقمت پہنچی، ہم اس سے عبرت حاصل کریں۔

اس سلسلہ میں جس طرح اس نے بعض مردوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح بعض عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے وجوہ ہیں۔

۱۔ ہمجنس ہمجنس کے واقعات وحالات سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

۲۔ بعض اخلاقی معائب و محاسن مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض عورتوں کی خصوصیات میں سے ہیں بس تبلیغ ودعوت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہوا کہ دونوں صنفوں کا تذکرہ کیا جائے۔

۳۔ عورتوں کے واقعات بیان کرکے، خداوند تعالیٰ نے ان کی اہمیت آشکارا کردی کہ وہ کس حد تک مردوں کی سعادت وشقاوت کا ذریعہ ہوسکتی ہیں، کیونکہ ان کے خصائل وعادات، ان کے شوہروں اور بچوں پر کافی اثرانداز ہوتے ہیں۔ جو لوگ قوموں کی تاریخ پر غور کرتے ہیں، وہ جب بعض اہم واقعات کے اسباب وعلل کے سراغ میں نکلتے ہیں تو بسااوقات ان کا آخری سرا کسی پردہ نشین کی نازک انگلیوں میں پاتے ہیں۔ اسلئے اگر قرآن ان کا ذکر نہ کرتا، تو دقائق حکمت کا ایک عظیم الشان باب ہماری نگاہوں سے مخفی رہ جاتا۔

جو شخص قرآن مجید کے امثال پر غور کرے گا اور اخلاق وعادات کے خصوصیات و اثرات اور ان کے نفع وضرر کے مدارج پر حکیمانہ نظر ڈالے گا۔ اسکو یہ حقیقت صاف نظر آئیگی کہ عورتوں کی بعض عادتوں کے برے اثرات، ان کے شوہروں تک متعدی ہوجاتے ہیں۔ مثلاً عورتوں میں تجمل اور زینت وآرائش کا شوق غیر معمولی ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کے شوہروں کو آمادہ کرتی ہے کہ جس ذریعہ سے ممکن ہو ان کے لئے دولت حاصل کریں اور اس دولت کو

ادائے حقوق اور اعانت مستحقین کی جگہ ان کے جسموں پر لاد دیں۔ اس طرح جو مال بقائے حیات کی بنیاد اور حصولِ نجات کا ذریعہ ہے، بدبودار پانی کی طرح ایک جگہ بند ہو جاتا ہے، جس کی مضرتیں بڑھتی اور پھیلتی ہیں اور فوائد مفقود ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات کو دنیا کی زینت سے نفرت دلائی اور اس چیز کے معائب جس تفصیل سے بیان کئے، کسی دوسری چیز کو اس تفصیل سے نہیں بیان کیا، یہاں تک کہ اس کو جاہلیت کی یادگار اور نجاست سے تعبیر کیا۔

عورتوں کی زر پرستی کی علت صرف زینت و آرایش کا شوق ہی نہیں ہے بلکہ بخل انکی فطرت کا ایک مستقل عنصر ہے۔ اسی وجہ سے وہ عموماً اپنے شوہروں کو فیاضی اور سخاوت سے روکتی ہیں۔ قرآن مجید نے متعدد جگہ اس راز کو آشکارا کیا ہے، اور مردوں کو متنبہ کیا ہے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکیں تو ان کی بات پر کان نہ دھریں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بھی ہدایت کی ہے کہ ان کے معاملہ میں عفو و درگذر سے کام لیں۔ جو لکڑی سیدھی نہیں ہوتی ضرور نہیں کہ توڑ دی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا	اے ایمان والو تمھاری بیویوں اور بچوں
اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ	میں تمھارے دشمن ہیں (یہاں ازواج کے ساتھ
وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا	اولاد کو بھی شامل کرلیا کیونکہ انکی محبت بھی آدمی
لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ	کو بخل پر آمادہ کرتی ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم
وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا	نے فرمایا ہے "الولد مبخلة مجبنة" اولاد آدمی

وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ .... (۶۴ - ۱۴) ....

کیلئے بخل اور بزدلی کا سبب ہوتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زبان سے کہکر بخل پر آمادہ کرتے ہیں) پس ان سے بچو (یعنی اس شر سے جو ان کی وجہ سے تم کو پہنچ سکتا ہے) اور اگر تم معاف کروگے درگذر کروگے اور بخشوگے تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۶۴-۱۶)

پس اللہ سے جہاں تک ڈر سکتے ہو ڈرو اور سنو اور اطاعت کرو اور اپنے لیے، خدا کی راہ میں خرچ کرو اور جنھوں نے بخل سے نجات پائی وہی فلاح پانے والے ہیں۔

عربی شعرا فیاضی پر عورتوں کی ملامت کا بہت تذکرہ کرتے ہیں مثلاً حاتم طائی کہتا ہے:

وعاذلة هبت بليل تلومني   وقد غاب عيوق الثريا فعردا

اور کتنی ملامت کرنیوالی عورتیں رات میں مجھے ملامت کرتی ہوئی اٹھتی ہیں اور حال یہ ہے کہ عیوق ثریا غائب ہو چکا ہے (یعنی بہت رات گزر گئی ہے)

تلوم على اعطائي المال ضلة   اذا ضن بالمال البخيل وصردا

وہ مجھے میری فیاضی پر عبث ملامت کرتی ہیں، ایسے زمانہ میں جبکہ بخیل اپنے مال کو بچا کر رکھتا ہے اور تھوڑا تھوڑا خرچ کرتا ہے (بخیل زیادہ نہیں دیتا ہے)

تقول الا امسك عليك فانني   ارى المال عند الممسكين معبدا

وہ کہتی ہیں اپنا مال اپنے لئے بچا رکھو کیونکہ اس زمانہ میں بخیل کو اپنا مال بہت عزیز ہوتا ہے۔

ذرینی یکن مالی لعرضی جنة　　یقی المال عرضی قبل ان یتبذا

میں جواب دیتا ہوں کہ مجھے بخشو کہ میرا مال میری آبرو کیلئے سپر بن سکے۔ وہ تقسیم ہونے سے پہلے ہی میری آبرو کو بچا سکتا ہے۔

یہی شاعر کہتا ہے :۔

وعاذلتین ھبتا بعد ھجعة　　تلومان متلافا مفیدا ملوما

اور دو ملامت کرنیوالی عورتیں ایک ایسے نوجوان کو ملامت کرتی ہوئی اٹھیں جو دریا دل اور صاحب فیض ہے

اور اپنی فیاضیوں کی وجہ سے ہمیشہ ہدف ملامت بنا رہتا ہے۔

تلومان لما غور النجم ضلة　　فتی لا یری الاتلاف فی الحمد مغرما

وہ ایسے زمانے میں جبکہ ثریا ڈوب گئی ہے (یعنی جاڑے کے زمانے میں) ایک ایسے نوجوان کو عبث

ملامت کرتی ہیں جو مستحق ستایش کاموں میں خرچ کرنا تاوان نہیں خیال کرتا۔

عورت کی اس فطرت کو نگاہ میں رکھو، اور تیسری فصل میں گذر چکا ہے کہ ابولہب کی دولت اچھی راہ سے نہیں آئی تھی۔ اس کی زرپرستی اور طمع مال نے اس کو بدترین معاصی کا مرتکب بنایا۔ اس نے اللہ سے خیانت کی۔ رشتۂ رحم کو توڑا، پیغمبر سے دشمنی کی اور اسی عداوت کی آگ میں جل کر مر گیا۔ جو شخص ان باتوں کو سامنے رکھکر اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ اللہ تعالےٰ نے اس کے عذاب میں اس کی بیوی کو بھی شریک کیا، اس کو اس بات میں شک نہ ہوگا کہ اس عذاب کے اسباب پیدا کرنے میں وہ بھی برابر کی شریک تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو مجبور کیا کہ وہ حرام وحلال، جس راہ سے ممکن ہو، اسکی زینت وآرایش کا سامان فراہم کرے تاکہ ہم چشموں میں اسکی گردن بلند ہو۔ اس کیلئے وہ اداے حقوق سے مانع ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

وہ بھی شریکِ عذاب قرار دی گئی۔ خداوند تعالیٰ بغیر شرکتِ عمل کے کسی کو کسی کا شریک نہیں بناتا۔ اس کے علاوہ قرآن نے اس کی جو حالت بیان کی ہے، وہ بھی اس تاویل کی تائید کرتی ہے۔ اور اس بات کو کھولتی ہے کہ درحقیقت اسی نے ابو لہب کو ان معاصی پر آمادہ کیا۔ تفصیل اگلی فصل میں آئے گی۔

ان وجوہ سے اللہ تعالیٰ نے جس طرح ابو لہب کو مردوں کیلئے نمونۂ عبرت قرار دیا، اسی طرح اس کی بیوی کو عورتوں کیلئے مثال ٹھہرایا کہ عالم انسانی کے دونوں طبقے بخل اور شوقِ زینت کے برے نتائج سے آگاہ ہو جائیں۔ اور لوگ اپنی بیویوں سے خبردار رہیں کہ وہ ادائے حقوق اور انفاق فی سبیل اللہ سے روک کر ان کیلئے کس قدر خوفناک فتنہ بن سکتی ہیں! اس سے ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بخل کوئی معمولی برائی نہیں ہے، بلکہ یہ بیشتر برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ زکوٰۃ کا ضد ہے۔ جو تمام اعمال صالحہ کا نصف ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ — جو بخل سے محفوظ رہے، انہی
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۶۳-۱۶) — نے فلاح پائی۔

قرآن پاک میں متعدد سورتیں بخل کی مذمت کیلئے مخصوص کی گئیں، مثلاً سورۂ تطفیف، سورۂ تکاثر، سورۂ ہمزہ، حالانکہ خالص توحید کے مضمون کیلئے صرف ایک ہی سورہ مخصوص کی گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بخل کس قدر خوفناک برائی ہے اور عورتوں کا شوقِ زینت اور ادائے حقوق سے مانع ہونا کتنا بڑا فتنہ ہے؟ اس نصیحت کی اہمیت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ عورتوں کی اس عادت کو مفید مصلحت خیال کرتے ہیں،

لفظ "حمالۃ الحطب" کی حکمت اور جزاء و عمل کی مشابہت

۱۲- قرآن مجید میں مغرور امراء اور متکبر ارباب ثروت کیلئے ذلت و اہانت کا عذاب بیان کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ چیز ان کیلئے سب سے زیادہ دردانگیز ہے۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:۔

بضرب فیہ توھین و تخضیع و اقران

ہم نے ان کو ایسی مار ماری جو توہین، ذلت اور تسخیر سب کا مجموعہ تھی۔

عرب میں مثل ہے کہ "النار ولا العار" "آگ میں جل جانا گوارا ہے مگر ذلت نہیں"!

خداوند تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ تمھارے لئے آگ اور ذلت دونوں ہیں۔

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ	آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائیگا
الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ	کیونکہ تم زمین میں متکبر تھے
فِي الْاَرْضِ وَبِمَا كُنْتُمْ	اور خدا کے حکموں سے سرتابی
تَفْسُقُوْنَ (۴۶-۲۰)	کرتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (۶۸-۱۶)	ہم عنقریب اس کے نتھنے پر داغ لگائیں گے۔

ایک جگہ فرمایا۔

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ	(خدا کا عذاب) چکھو، تم دنیا میں عزیز
الْكَرِيْمُ (۴۴-۴۹)	اور باعزت تھے،

اسی طرح عموماً جزاء کو عمل کے مناسب بیان کیا گیا ہے تاکہ جزاء کا عدل ہونا بالکل واضح ہو جائے۔ ہم آٹھویں فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ زرپرستی اور پیغمبر عالم کی عداوت کے جوش نے ابولہب کے نفس کو مشتعل آگ بنا دیا تھا۔ نیز دسویں فصل میں گذر چکا ہے کہ اسکی بیوی نے زینت و آرایش اور زیوروں کے شوق میں اس کو ان معاصی پر آمادہ کیا اور اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اس کو شریک عذاب قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا "سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ وَّامْرَأَتُهٗ" اور اسکی حالت "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کے لفظ سے بیان کی جسمیں جزاء و عمل کی مشابہت کے بہت سے وجوہ ہیں۔

(۱) اس کو دنیا میں جو عزت و عظمت حاصل تھی، آخرت میں اس سے محروم ہو کر، ذلت و خواری میں مبتلا ہو گی۔

(۲) وہ جن قیمتی زیوروں پر فخر کرتی تھی، وہ خود اس کے جلانے کے لئے ایندھن بن جائینگے۔ ان دنیوی زخارف کی حقیقت ایندھن سے بہت اشبہ ہے۔ گویا قیامت کے دن اسکی حالت اس شخص کی ہوگی جو اپنی سولی کا تختہ اور اپنے جلانے کیلئے ایندھن اپنے سر پر لئے ہوئے ہو۔ یہی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَھُمْ عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ ۔ وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوئے
اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (۶-۳۱) ۔ ہوں گے، اور آگاہ: یہ برا بوجھ ہو گا۔

(۳) اسی نے ابولہب کی خباثت نفس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکایا اس لئے گویا یہی اس کی آگ کے لئے ایندھن فراہم کرنے والی ہوئی۔ پس دنیا میں اس کے اس عمل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی صورت میں اٹھائی جائے۔

اس کے متعلق حضرت سعید بن جبیرؓ سے جو روایت ہے وہ ہمارے قول سے بہت ملتی جلتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "حطب" سے وہ گناہ مراد ہیں جنکی رسول اللہ صلعم کی عداوت میں وہ مرتکب ہوئی کیونکہ وہ اس کو آگ میں جلانے کیلئے بمنزلہ ایندھن کے ہیں۔

(۴) آگے گذر چکا ہے کہ ابو لہب کی سزا اس کی حالت کے بالکل مناسب بیان کیگئی ہے۔ یہی مناسبت اس کی بیوی کی سزا میں بھی مرعی ہے۔

(۵) صرف "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پانچویں آیت میں ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی تصویر کھینچ دی تفصیل آگے آتی ہے۔

پانچویں آیت کی تاویل اور ماقبل سے اسکا تعلق

۱۴۔ چونکہ "فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ" میں اس کی قیامت کی حالت کا بیان ہے۔ اس لئے بعض اہل تاویل نے "حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ" سے وہی چیز مراد لی ہے جس کا ذکر قرآن پاک نے کفار کے حالات کے سلسلہ میں سورہ حاقہ کی اس آیت میں کیا ہے۔

فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ (۶۹-۳۲) — ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں نے لفظ "مسد" کے معنی بدل دیے ہیں بلکہ اس کی تاویل انھوں نے عام معذبین کے مشابہ کر دی ہے جن کا بیان قرآن مجید میں ہوا ہے۔ حالانکہ لفظ کو بغیر ضرورت، اس کے ظاہری معنی سے ہٹانا جائز نہیں ہے۔ اسی

دوسرے لوگوں نے اس کی تفسیر حقیقی معنی کے اعتبار سے کی ہے۔ کیونکہ یہ لفظ عربی زبان میں معروف ہے۔ اس کے اسم و فعل سب عام طور پر مستعمل ہیں۔

لغت میں "مسد" کا لفظ کھجور کے اس ریشے پتی اور چھلکے کے لئے بولا جاتا ہے جس سے مضبوط رسیاں بٹی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ عام طور پر مضبوط اور موٹی رسی کیلئے بھی مستعمل ہے۔ وہ کھجور کے ریشہ کی ہو یا چمڑے کی یا اسی قسم سے کسی اور چیز کی۔ چرخی کی رسی کیلئے اس کا استعمال عام ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ موٹی اور مضبوط رسی کے معنی میں عام ہے۔ "مسد الحبل" کے معنی ہیں رسی کو خوب مضبوط بٹا۔ پس ظاہر تاویل یہ ہوگی کہ جب وہ قیامت کے دن اٹھیگی، اس کی گردن میں ایک مضبوط اور اس سے زیادہ موٹی رسی پڑی ہوگی جو معمولاً ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں ہوتی ہے۔ اب اس زیادت کے فوائد پر غور کرو۔

۱- اسمیں اسکی اس حالت کی توضیح ہے جو لفظ حمالۃ الحطب میں بیان ہوئی ہے۔

۲- اسمیں اس ذلت کی تصویر ہے جس میں بالآخر وہ گرفتار ہوگی۔

۳- اس میں عمل اور نتائج عمل کی موافقت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جس ہار کو پہنکر وہ اتراتی تھی وہ قیامت کے دن موٹی رسی کی شکل میں بدل جائیگا جس کی وجہ سے اس کی مثال اس لونڈی کی ہوگی جو گلے میں رسی ڈالکر لکڑیاں چننے جارہی ہو۔

۴- معزز عورتیں محض آرایش پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ سامان آرایش کے حجم اور وزن کا بھی خاص خیال رکھتی ہیں۔ اس مناسبت سے ضروری ہوا کہ رسی موٹی ہو۔

عربی زبان میں گردن کے لئے عنق کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ لیکن یہاں قرآن نے "جید" کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے بھی مذکورہ اشارات کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ جید کا لفظ عام طور پر اچھے مواقع یعنی اظہار فخر و تمکنت کیلئے مستعمل ہے۔ مثلاً امرا القیس کہتا ہے

وجید کجید الریم لیس بفاحش   اذا ھی نصته ولا بمعطل

اور اسکی گردن ہرن کی گردن کی طرح تھی لیکن جب اس کو اٹھاتی تھی تو اس کی درازی غیر مستدل نہ تھی اور نہ زیورات سے خالی تھی۔

امرا القیس ہی کے ایک شعر کا مصرع ہے۔

بجید معم فی العشیرۃ مخول

انکی گردنیں اس باعزت آدمی کی طرح اونچی تھیں جس کے ماموں اور چچا اپنے بھائی بندوں میں باوقار ہوں۔

اگر اس موقع پر ان حقائق کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہ ہوتا تو سختی اور خشونت کے موقع اور موٹی رسی کی مناسبت سے "عنق" کا لفظ زیادہ موزوں ہوتا۔ قرآن مجید میں ایسے مواقع پر "عنق" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ ٢٦ پس انکی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔

دوسری جگہ ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا ٣٦ - ٨ ہم نے ان کی گردنوں میں بھاری طوق ڈالدیئے ہیں۔

اگر یہاں یہ توضیح و تصویر اور تنبیہ مقصود نہ ہوتی جسکا ہم نے ذکر کیا ہے تو اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا، نیز پہلے قوافی کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں کوئی ایسا لفظ لایا جائے جسکا آخری حرف "ب" ہو۔ اگر مقصود محض شدت عذاب کو بیان کرنا ہوتا تو عربی زبان کے

محاورات واسالیب کے وسیع دامن میں کسی مناسب قافیہ کی کمی نہ تھی۔ لیکن یہاں قافیہ کی رعایت چھوڑ دی گئی جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس آیت میں ایک اہم حقیقت کا بیان مقصود ہے۔ اور اس میں ایک ایسے امر کا تذکرہ کیا گیا ہے جو واقع ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ جزاء اور عمل کی اس مشابہت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

سُورہ کا زمانہ نزول

۱۴۔ جو لوگ اس سورہ کے زمانۂ نزول میں موجود تھے ان سے اس کے زمانۂ نزول کے متعلق کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے البتہ بعض علماء نے قرائن و حالات اور سورہ کے سیاق و سباق سے استنباط کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ مکہ میں اتری غالباً اس خیال کی بنا یہ ہے کہ یہ لوگ اس کو ابولہب کی سخت کلامی کا جواب سمجھتے ہیں۔ ابولہب غزوۂ بدر کے بعد مرا ہے۔ اس لئے یہ قطعی ہے کہ یہ سورہ اس کی موت سے پہلے اتری ہے۔ اسلوب کلام سے ایسا ہی متبادر ہوتا ہے۔ اگر ابولہب اس کے نزول سے پہلے مر چکا ہوتا تو انداز کلام دوسرا ہوتا۔ مثلاً کہا جاتا "الم تر کیف تبت یدا ابی لھب" کیا نہیں دیکھا کس طرح ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے" یا اسی کے مشابہ کوئی اور پیرایہ بیان اختیار کیا جاتا۔ بہرحال یہ قطعی ہے کہ اس میں واقعہ کی خبر واقع ہونے سے پہلے دی گئی ہے۔ ہم نے عبارت اور اسلوبِ کلام سے جو مطلب سمجھا ہے، روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ اوئلِ بعثت میں نہیں اتری ہے۔

جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں جو اس کو ابولہب کی سخت کلامی کا جواب خیال کرتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے تفصیلات گذر چکی ہیں، یہ ابولہب کے جواب میں نہیں ہے بلکہ ہونیوالے واقعہ کی پیشینگوئی اور خبر ہے، اس لئے لازماً اس وقت اتری ہے جب ابولہب کا کفر پر اصرار بالکل واضح ہوگیا ہے۔ اس حد تک پہنچ جانے کے بعد اتمام حجت کا فرض ادا ہوگیا اور خدا کے قانون کے مطابق ضروری ہوا کہ پیغمبر عالم (صلعم) اس سے اعراض فرمائیں۔ معاملہ اس حد تک پہنچ جانیکے بعد خدا کا قانون یہ ہے۔

فَاَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا	جنہوں نے ہمارے ذکر سے منہ پھیر لیا اور صرف دنیا کی
وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	زندگی پر قانع ہوگئے ان سے اعراض کرو ان کے علم
ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ	کی رسائی یہیں تک ہے (یعنی وہ اپنے علم کی اس تنگنائے
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ	سے نکل کر اس عالم کی چاہ نہیں کرسکتے جو اس عالم سے
عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ	ماورا ہے) بیشک تمہارا رب ان لوگوں کو خوب
اهْتَدٰى (۵۳-۲۹و۳۰)	جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گئے اور انکو خوب
. . . .	جانتا ہے جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔

یعنی جن کے افعال واقوال سے اس امر کی شہادت مل گئی کہ کفر پر مصر اور آخرت سے نفور ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان سے اعراض کا حکم دیتا ہے۔ جب خداوند تعالیٰ نے اس امر کی خبر دیدی کہ وہ راہ ہدایت اختیار نہیں کریں گے تو ان کی ہدایت کی توقع نہ کرو۔ خدا نے ہر چیز کے لئے ایک قانون بنایا ہے اور ہر معاملہ کی ایک حد قرار دی ہے۔ جب کفار کے توبہ کی مدت ختم ہوچکی تو اب ان کے معاملہ میں وہ مسامحت نہیں کریگا۔ چنانچہ فرمایا۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ | کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جتنے میں سوچنے والا
مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (۳۵-۳۸) | سوچ لے اور آیا تمھارے پاس ڈرانیوالا۔

جب یہ مدت ختم ہو جاتی ہے اور ان کی شقاوت واضح ہو جاتی ہے، خداوند تعالیٰ ان کی دعوت اور ان کے ساتھ اضاعت وقت سے پیغمبر کو روک دیتا ہے جیسا کہ فرمایا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا | نبی اور مومنین کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ
اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ | مشرکین کے لئے مغفرت چاہیں، اگرچہ
وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ | وہ قرابت دار ہوں۔ جب ان پر
مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ | یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ جہنم میں پڑنے
الْجَحِيْمِ (۹-۱۱۳) | والے ہیں۔

اس آیت پر غور کرو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک مدت قرار دی ہے جس میں کفار کے متعلق مومنین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایمان لانیوالے نہیں ہیں اور جہنم میں پڑیں گے۔ دوسرے مقام پر فرمایا۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ | اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت چاہنا نہیں
لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ | تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس
وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ | سے کیا تھا، پس جب اس پر حقیقت کھل گئی
لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ | کہ یہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے بری ہو گیا۔
مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ | بیشک ابراہیم نہایت نرم دل اور مرد بار تھا۔
(۹-۱۱۴)

جب حضرت ابراہیمؑ کو یقین ہو گیا کہ ان کے باپ پر ایمان کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔ وہ ان سے بری ہو گئے۔ اس اصول کو سامنے رکھو اور ان کفار کے معاملہ پر غور کرو جن پر خدا نے دنیا میں عذاب نازل کیا اور ہلاک کر دیا۔ ان کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ ان کے توبہ کا امکان باقی تھا اس لئے یہ عذاب ان پر ظلم ہوا کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ان کی ہلاکت اس وقت ہوئی ہے جب یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ایسے ہی کفار کے بارہ میں فرمایا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ	ہم نے تم سے پہلے بہت سی قومیں ہلاک
مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ	کر دیں جب انھوں نے ظلم کیا اور ان کے
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا	انبیاء کھلی کھلی آیتیں لیکر آئے اور وہ
لِيُؤْمِنُوْا (۱۰-۱۳)	ایمان لانے والے نہیں تھے۔

یعنی مستقبل میں بھی ان کے ایمان کی توقع نہ تھی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب جان بوجھ کر ٹھنڈے دل سے برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے تو ان کا ضرر نہایت ہولناک ہو جاتا ہے اور وہ انسان کا ہر طرف سے اس طرح احاطہ کر لیتی ہیں کہ اس پر ہدایت کا دروازہ بالکل بند اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکلنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا نے اعمال اور ان کے نتائج کا جو قانون تمام کائنات میں جاری کیا ہے اسکی زنجیریں اسکو مسخر کر لیتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا اپنی طرف سے کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ انسان خود گمراہی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت

کی طرف اشارہ ہے

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ خود

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹-۲۰) اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ برے اعمال کے نتائج گمراہی، کج دلی، قساوت قلب اور مخاصمت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲-۲۶) اور اس کے ذریعہ سے نہیں گمراہ کرتا مگر نافرمانوں کو۔

دوسری جگہ ہے۔

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱-۵) جب وہ کج ہو گئے خدا نے ان کے دل کج کر دیئے۔

ایک جگہ ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ پس ان کی معاہدہ شکنی کے باعث ہم نے ان پر لعنت

وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (۵-۱۳) کی اور ان کے دل سخت کر دیئے۔

ایک مقام پر فرمایا۔

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا پس وہ اس کتاب کا ایک حصہ بھول گئے جس کے ذریعہ انکو یاددہانی

بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ (۵-۱۴) کیگئی تھی تو ہم نے انکے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی

پھر فرمایا۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے

مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳-۱۴) اعمال کی سیاہی جم گئی ہے۔

ایضاً

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ	پس اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں خدا نے
اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا	نفاق پیدا کر دیا اس دن تک کیلئے جس دن وہ اس سے
اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا	ملیں گے بوجہ اسکے کہ انھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اسکی
يَكْذِبُوْنَ (۹-۷۷)	خلاف ورزی کی اور بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولے۔

ایضاً

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا	اور وہ ایمان لانیوالے نہیں تھے کیونکہ انھوں نے
مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ	اس سے پہلے تکذیب کی اسی طرح اللہ تعالے
عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۷-۱۰۱)	کافروں کے دلوں پر مہر کر دے گا۔

ایضاً

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ	ان کو چھوڑ دو کھالیں اور نفع اٹھالیں اور اپنی
الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۱۵-۳)	آرزوؤں میں مگن رہیں عنقریب جان لیں گے۔

الغرض اتمام حجت کے بعد دین کی دعوت سے وہ لوگ محروم کر دیئے جاتے ہیں جو اپنے کفر و نفاق پر جمے رہنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے پیغمبر کو اعراض کرنے کا حکم دیتا ہے کہ ان پر عذاب کا قانون پورا ہو گیا جیسا کہ فرمایا ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا	پس ان کو چھوڑ دیجئے بحثیاں کرلیں اور
حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِىْ	کھیل لیں یہاں تک کہ اس دن سے دوچار

يُوعَدُونَ (۷۰-۴۲) ہوں جس کا وعدہ کئے جاتے ہیں۔

ان آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ اس سورہ میں ابو لہب کی ہلاکت کی جو خبر دی گئی ہے یہ اس وقت سے متعلق ہے جب پیغمبر صلعم نے مایوس ہو کر اس سے اعراض کر لیا ہے۔

۲۔ یہ سورہ اس کو دعوت نہیں دیتی بلکہ مسلمانوں کو ان کے شدید ترین دشمن کی ہلاکت کی خوشخبری سناتی ہے۔

سورہ کے زمانہ نزول کے متعلق اس قدر واقفیت کافی ہے خواہ اس کا نزول ہجرت سے کچھ پہلے مکہ میں ہوا ہو یا ہجرت کے کچھ بعد مدینہ میں۔ اس کا فائدہ اگلی فصل میں معلوم ہوگا۔

اس سورہ میں تکلیفِ مالایطاق کا کوئی ثبوت نہیں ہے

اشاعرہ نے اس سورہ سے تکلیف مالایطاق کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کو اس کام کی تکلیف دیتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔ لیکن حنفیہ اور بعض اکابر شافعیہ مثلاً امام ابو محمد اسفرائنیؒ اور امام غزالیؒ اس رائے میں ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اشاعرہ کا یہ استدلال ان معتزلہ کے جواب میں ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے۔ اہل سنت کے اکثر فرقے اس وجوب سے بہت بیزار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو پسند کرتا ہے حکم دیتا ہے۔

وہ سب کا خالق ہے اور تمام جہان مخلوق ہے۔ مخلوق، خالق پر کوئی چیز کیونکر واجب کر سکتی ہے؟ اس رد و انکار کے معرکہ نے جیسا کہ اس قسم کی معرکہ آرائیوں میں لازماً ہوتا ہے نہایت خوفناک شکل اختیار کر لی ہے اور ہر فریق نے آنکھ بند کر کے جس رطب و یابس کو اپنے موافق خیال کیا، دلیل و حجت قرار دیکر حریف کے سر پر دے مارا۔ یہ اختلاف درحقیقت اس معرکہ کی ایک شاخ ہے جو مسئلہ عدل پر فریقین میں قائم ہے اور جس کیلئے مناظرہ و مجادلہ کی نہایت خوفناک جنگیں برپا ہو چکی ہیں اس لئے جب تک اصل مسئلہ اور اسکے متعلقات و فروع پر تفصیلی بحث نہ کی جائے حقیقت بے نقاب نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ یہ جگہ اس قسم کی تفصیل کیلئے موزوں نہیں ہے اس لئے ہم اس مسئلہ سے وہیں تک تعرض کریں گے جہانتک اس سورہ سے تعلق ہے۔

اس سورہ میں جو خبر دی گئی ہے اس سے امام ابوالحسن اشعریؒ نے تکلیف مالا یطاق کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ابانہ میں فرماتے ہیں۔

اور ان سے (معتزلہ) کہا جائے گا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ، اور اس کے باوجود اس کو ایمان لانے کا حکم دیا اس طرح اس کے اوپر واجب کیا کہ وہ یہ جانے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے متعلق اس خبر میں صادق ہے اس کے باوجود حکم دیا کہ وہ ایمان لائے اور ایمان اور یہ علم کہ یہ نہیں ہوگا دونوں جمع نہیں ہو سکتے صاحب قدرت اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایمان لائے اور یہ بھی جانے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ لیکن جب یہ بات اسی طرح ہو

تو اللہ تعالیٰ نے ابو لہب کو ایسی بات کا حکم دیا جس پر وہ قادر نہیں تھا۔
کیونکہ اس نے اس کو حکم دیا کہ وہ ایمان لائے اور وہ جانتا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیگا۔"

لیکن اس استدلال میں دو باتیں فرض کرلی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سورہ کا مخاطب ابو لہب ہے اور اس کو اس بات کا یقین کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ دوسری یہ کہ یہ سورہ ابو لہب پر اتمام حجت اور آنحضرت صلعم کے اعراض سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ حالانکہ فصل سابق میں ان دونوں شبہوں کی بدلائل تردید کی جاچکی ہے۔ اس لئے اس استدلال کی بنیاد ہی غلط ہے۔

امام رازیؒ نے اس دلیل کو جمع بین النقیضین کے قالب میں ڈھال کر ایک نئے آب و رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک استدلال کی صورت یہ ہے کہ یہ اجتماع نقیضین ہے جو بالبداہۃ محال ہے، محال پر کسی کو قدرت نہیں۔ جب اللہ تعالےٰ نے محال کا حکم دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تکلیف مالایطاق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اہل سنت نے تکلیف مالایطاق کے وقوع پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابو لہب کو ایمان کی تکلیف دی اور منجملہ ایمان کے ان تمام باتوں کی تصدیق بھی ہے جن کی خدا نے خبر دی ہے اور جن امور کی خبر دی ان میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیگا۔ اور وہ دوزخی ہے۔ اسطرح وہ اس بات کا بھی مکلف

ہوا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور اس بات کا بھی کہ ایمان نہیں لائے گا اور یہ جمع بین النقیضین کی تکلیف ہے۔ اور یہ محال ہے۔"

اس کے بعد معتزلہ کی طرف سے دو مبہم جواب دیکر انکی تردید کی ہے اور آخر میں یہ کہکر کہ "یہ اشکال علی حالہ قائم ہے"۔ آگے بڑھ گئے۔

ہمارے نزدیک یہ جمع بین النقیضین والی دلیل مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ یہ دلیل اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی جب تک دو باتیں ثابت نہ ہوجائیں۔ ایک یہ کہ جس وقت سورہ اتری ہے اس وقت ابو لہب ایمان کا مکلف تھا اور اعراض کا مستحق نہیں ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ وہ اس سورہ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ہم پچھلی فصل میں تفصیل بیان کرچکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو ان لوگوں سے اعراض کا حکم دیا ہے جو اتمام حجت کے بعد بھی نشۂ غرور میں مست اور اپنے کفر پر مصر ہیں، اس لئے حریف یہ کہہ سکتا ہے کہ جس وقت سورہ اتری ہے اس وقت ابو لہب ایک تکلیف کا بھی مکلف نہ تھا دو تکلیفوں کا کیا ذکر۔

۲۔ حریف کے نزدیک کفار سے جزئیات احکام پر ایمان لانے کا اس وقت تک مطالبہ نہیں ہے، جب تک وہ کلمۂ توحید اور اطاعت کا اجمالی اقرار نہ کرلیں۔ اس منزل سے گذر جانے کے بعد وہ ایمان تفصیلی کے مکلف ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا — اے ایمان والو، اللہ پر اور اس کے

بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ	رسول پر اور اس کتاب پر جو اتاری
الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ	اپنے رسول پر اور اس کتاب پر
وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ	جو اس سے پہلے اتاری، ایمان لاؤ
قَبْلُ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَ	اور جو لوگ اللہ، اس کے ملائکہ،
مَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ	اس کی کتابوں، اس کے رسولوں
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ	اور آخرت کا انکار کریں گے وہ نہایت
ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴-۱۳۶)	سخت گمراہ ہوئے۔

اس لئے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابولہب ایمان اجمالی کا مکلف تھا تو یہ تسلیم کرنا ضروری نہیں کہ وہ اس سورہ کا مخاطب ہو اور جو کچھ اس میں خبر دی گئی ہے اس پر ایمان لانے کا مکلف بھی تھا۔ اس صورت میں جمع بین النقیضین نہیں باقی رہتا۔

۳۔ قرآن نے یہ خبر نہیں دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ اور نہ یہ کہا ہے کہ وہ دوزخی ہے۔ اس نے محض یہ خبر دی ہے کہ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ محض آگ میں پڑنا اس کے لئے مستلزم نہیں کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور دوزخ میں ہمیشہ رہے گا۔

۴۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن نے اس کے دوزخی ہونے کی خبر دی ہے تو کیا یہ خبر بعینہ اس بات کی خبر ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا؟ سب کو معلوم ہے کہ

کفار قیامت کے روز ایمان لائیں گے، تاہم ان کو یقین ہوگا کہ وہ دوزخی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ تصدیق دلائل کے تابع ہے، جب کسی شخص کے سامنے کسی چیز کے دلائل واضح ہو جائیں گے، اس کی تصدیق کر دے گا۔ اور باوجود اس کے اگر اس کے سامنے اس بات کے دلائل بھی واضح ہوں کہ وہ مستحق نار ہے تو اس میں داخل ہونے کا بھی یقین کرے گا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے اقرار ایمان کا کیا جواب قرآن مجید میں ہے۔

حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ	یہاں تک کہ جب ڈوبنے کا وقت آ گیا اس نے
اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىٓ	کہا کہ میں ایمان لایا، نہیں ہے کوئی معبود
اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا	مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، آٰلْئٰنَ وَقَدْ	ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔
عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ	اب حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی
الْمُفْسِدِيْنَ (١٠-٩٠ و ٩١)	کی اور تم فساد پھیلانے والوں میں سے تھے۔

اس میں خداوند تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا کہ تو ایمان نہیں لایا، یا تو نہیں لایا، بلکہ یہ فرمایا کہ اب قبول ایمان واسلام کا وقت گذر گیا۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ	وہ تم سے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم راضی ہو جاؤ
فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ	ان سے اگر تم ان سے راضی بھی ہو گئے تو اللہ

لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۔ نافرمان قوم سے راضی نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس فعل اور اس کے مقبول ہونے میں بڑا فرق ہے۔ بندہ صرف فعل کا مکلف ہوتا ہے اس کی قبولیت کا مکلف نہیں ہوتا۔ الغرض اگر دخول نار اور ایمان میں کوئی تناقض ہوتا تو کسی حالت میں مجتمع نہیں ہو سکتے تھے، لیکن بعض حالتوں میں ان کا اجتماع معلوم ہے۔ اس لئے تناقض باقی نہیں رہا۔

۵۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیگا۔ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان باللہ والرسول اور اطاعت کی تکلیف دی تھی، یا اس بات کی کہ وہ یقین کرے کہ وہ مومن ہے۔ اور جہنم سے محفوظ رہے گا؟ پھر تناقض کہاں رہا؟

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان دلائل کا نتیجہ ہے لیکن عمل صالح کے لئے کوئی وجہ رغبت ناگزیر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دیدی ہے کہ ابولہب دوزخی ہے تو جس عمل کا وہ مکلف ہے اس کے لئے کس منفعت کی امید محرک ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نفع کی امید کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتی کیونکہ عذاب کے مدارج ہیں، اس لئے نیک عمل ممکن ہے دنیا میں کچھ نفع بخش ہو یا آخرت میں اس کے آلام میں کچھ تخفیف کا باعث ہو۔ جو بیماریاں دور نہیں ہو سکتیں ان کا بھی علاج کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے ان کی اذیت ہی کچھ کم ہو جائے

نیز عمل صالح بذاتہ جمیل ہونے کے علاوہ حسن شہرت اور ستایش کا باعث ہے، اسلئے دلائل قرآن اس کے سامنے ان چیزوں کو ثابت کرتے ہیں جن پر اس کو ایمان لانا چاہیئے اور اس نفع کی امید اس کے لیے عمل کی محرک ہوسکتی ہے، اگرچہ اس کو یقین ہو کہ وہ خدا کے مقبول بندوں میں نہیں داخل ہوسکتا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس استدلال کی صحت ایسی باتوں کے فرض کرنے پر مبنی ہے جن کی نہ صرف یہ کہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ دلیلیں ان کے خلاف ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھکر ہم یہ کہتے ہیں کہ صاحب استدلال نے جو دو تکلیفیں فرض کی ہیں اگر ان کو تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی کوئی تناقض لازم نہیں آتا، کیونکہ ان کا یہ دعوی کہ "وہ اس بات کا بھی مکلف ہوا کہ ایمان لائے گا اور اس بات کا بھی کہ ایمان نہیں لائے گا" ایک کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ وہ اس بات کا مکلف تھا کہ ایمان لائے، اس بات کا مکلف نہیں تھا کہ ایمان لائے گا، ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے، کیونکہ اس کو اس بات کی تکلیف نہیں دی گئی تھی کہ وہ ایمان لائے گا، بلکہ اس کو اس بات کی تکلیف دی گئی تھی کہ وہ ایمان لائے یعنی آنحضرت صلعم کی تعلیم پر ایمان لانے کی اور اس بات پر ایمان لانے کی کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور ان دونوں ایمانوں میں کوئی تناقض نہیں ہے، اسی طرح اس اخیر صورت میں بھی کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ تمام کفار بحالت کفر اس

بات پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

ان دلائل سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اجتماع نقیضین کا دعویٰ غلط ہے۔ اصلی استدلال اسی شکل میں باقی رہا جس شکل میں امام ابوالحسن اشعریؒ نے ابانہ میں پیش کیا ہے، اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں کہ اس کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اس میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ وہ دعوت ایمان کا بھی مخاطب تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی کہ اپنے کفر اور دخول نار پر ایمان لائے حالانکہ یہ خبر اس وقت دی گئی ہے جب اس سے اعراض کرلیا گیا ہے جیسا کہ پچھلی فصل میں گذر چکا ہے۔

الغرض جو لوگ تکلیف مالا یطاق کے مدعی ہیں ان کے مفید مطلب اس سورہ میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ رہا اصل مسئلہ تو اس پر مفصل بحث ہم نے علیحدہ کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نزاع محض لفظی ہے۔ امام اشعریؒ کا رتبہ اس سے ارفع ہے کہ ان کی طرف ایک ایسا عقیدہ منسوب کیا جائے جس سے ذات باری کی طرف ظلم کی نسبت ہوتی ہے۔ ہماری ناقص سمجھ میں اس سورہ کی جو تفسیر آئی تھی وہ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد وآلہ

وصحبہ اجمعین

تفسیر

سورۂ اخلاص

از

حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

سنہ ۱۳۵۰ھ
۱۹۳۱ء

مصنّف ہذا کی دُوسری کتابین

تفسیر سورہ تبت یدا ابی لہب (عربی) ۴ر
تفسیر سورۃ التحریم 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ عبس وتولیٰ 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ القیامہ 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ والتین 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ الکفرون 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ والعصر 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ والشمس 〃 ۴ر
تفسیر سورۃ والذاریات 〃 ۶ر

تفسیر سورۃ والمرسلات (عربی) ۴ر
تفسیر سورۃ والکوثر 〃 ۴ر
امعان فی اقسام القرآن 〃 ۸ر
الرای الصحیح فی من ہو الذبیح 〃 ۱۰ر
اسباق النحو حصہ اوّل و دوم (اردو) ۵ر و ۶ر
دیوان حمید بزبان فارسی (فارسی)
خرد نامہ 〃
تحفۃ الاعراب (اردو) ۲ر
تفسیر سورۃ اخلاص (〃) ۵ر

غلط نامہ

غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
دحانی	روحانی	۸	۵	( )	(۲۴)	۳۳	۲
جزیات	جزئیات	۱۲	۱۱	طاعت	اطاعت	۳۴	۸
ہوا	ہو	۱۵	۱۲	( )	(۲۵)	۳۶	۱۲
یدی	بدی	۳۲	۴	جھلک	جھلک	۳۸	۱
مکی	مذہکی	۲۲	۲				

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

از

سید سلیمان ندوی

حضرت مولنا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے علمی دنیا کو جو سخت صدمہ پہنچا ہی، اوسکی تلافی کی اگر کوئی صورت ہی تو یہی ہے کہ انکی غیر مطبوعہ تصانیف کی اشاعت کیجائے، مولنا کی متعدد مکمل و ناتمام تصانیف کے مسودے رکھے ہوئے ہین، اہل علم مین اونکی مانگ بھی ہے، مگر چونکہ وہ تمامتر عربی زبان مین ہین، اس لیے عام ناظرین اُن سے فائدہ نہین اٹھا سکتے، خوش قسمتی سے اونکے مسودون مین سورۂ اخلاص کی اردو تفسیر کا ایک مسودہ ملا، اور اُس کی اشاعت کی فکر کیگئی،

مولانا المرحوم ہمیشہ عربی و فارسی مین لکھتے تھے، اردو مین وہ بہت کم لکھتے تھے یہ سورۂ اخلاص کی تفسیر غالبًا قیام کراچی کے زمانہ مین کسی دوست کی فرمایش اور اصرار

پر اردو مین لکھی، اس اردو تفسیر کے معتدبہ نسخے چھپوائے گئے ہین، ایک تو اس لئے کہ مسلمانون کو اس سے فائدہ پہنچے، دوسری غرض یہ ہے کہ اس کے سرمایہ سے مولانا کی دوسری تصنیفات چھپوائی جائین،

یہ تصنیف ابھی تک مصنف کی تکمیل اور نظرثانی کی محتاج تھی، ایک دو جگہ بیاض بھی ہے، بلکہ ابھی تصنیف کے بجاے یہ یادداشت تصنیف کی صورت مین ہے، اس لئے اس کے سمجھنے کے لیے سرسری نظر کے بجائے غور وتعمق کی نگاہ کی ضرورت ہے،

اہتمام کے باوجود اسمین کہین کہین کتابت کے خفیف اغلاط رہ گئے ہین لیکن وہ بادنیٰ تامل سمجھ مین آجاتے ہین،

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بابرکت رسالہ سے مسلمانون کو خیر و برکت نصیب فرمائیگا،

سید سلیمان ندوی
دارالمصنفین اعظم گڈھ
۳۰ محرم ۱۳۵۷ھ

تفسیر اردو

سورۃ الاخلاص

از

مولانا حافظ حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ

مُصنّف

تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان،

حسب فرمائش رشید الدین صاحب فراہی برادر مصنف،

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپی،

سنہ ۱۳۵۰ھ

۱۹۳۱ء

کیا یہ لوگ قرآن مین تدبر نہین کرتے؟
کیا ان کے دلون پر قفل پڑے ہین؟

(سورۂ محمد آیت ۲۴ - ذکر منافقین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

بنام خدائے ہمہ مہر و مہربان

۱- قرآن پاک ایک ایسا کلام ہے کہ اوسے نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہین، اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔۔ خدائے پاک کو دیکھو کہ سب اوسے جانتے ہین، اور پھر کوئی بھی نہین جانتا، خود اپنے آپ کو سوچو کہ اور کسی چیز مین شک ہو تو ہو مگر اپنی ہستی مین کبھی شک نہین، مگر پھر دیکھو تو بقول غالب، ؎

ہم وہان ہین جہان سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہین آتی

قرآن خود بھی اپنے تئین کھلا اور آسان بتاتا ہے مگر دوسرے لحاظ سے مستور و عمیق، ایطرح خدائے پاک کی نسبت کہتا ہے کہ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی،

۲- ظاہر ہے کہ دو متناقض باتین اگر ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں، تو ضرور یہ اجتماع النقیضین آمیز

دو مختلف پہلوؤن سے ہوگا، پس قرآن پاک کا آسان اور مشکل دونون ہونا ضرور دو حیثیت سے ہوگا،
چنانچہ ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے وہ نہایت آسان ہے مگر اعلیٰ تعلیم اور دقیق مضامین کے
لحاظ سے نہایت مشکل ہے اور یہی مناسب بھی ہے کیونکہ جو لوگ اعلیٰ ترقی کی لیاقت تک نہین
پہنچے اُن کے لیے وہ مضامین اگر ظاہر بھی کر دیئے جائین تو بھی نہ تو وہ اُسے سمجھ سکین گے اور نہ
اُس سے فائدہ اُٹھائین گے بلکہ اون کے فائدہ اُٹھانے کی قابلیت کو بھی نقصان پہنچیگا، یہ اسلیے
کہ دین کا راستہ سیر باطن ہے، سیر باطن تفکر اور تدبر سے ہوتی ہے، اگر کسی شخص کو وہ باتین جو
وہ غور و فکر سے حاصل کر سکتا ہے پہلے ہی بتا دیجائین تو اوسکی قوتِ فکر ضائع ہو جائیگی، اور
اس بتائی ہوئی بات کو بھی اُس یقین کیساتھ نہین سمجھیگا جیسا کہ چاہیے، اور آیندہ کی ترقی سے
محروم رہیگا، اسی لیے خدائے تعالیٰ نے نظامِ عالم مین کوشش کو ضروری قرار دیا تاکہ انسان
اپنی اعلیٰ ترقی تک پہنچ سکے، تعلیم مین اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ تعلیم ایک
لفظ بےمعنی ہوگا، کیونکہ قوائے عقلیہ کے بیکار ہونے سے وہ علم بے ثمر ہوگا، یہ بات تو علم ظاہری کی ہے،
علم باطنی کو اس سے کچھ زیادہ خیال کرلو کیونکہ اس مین جاننا اوسی کا نام ہے جس کو ہونا کہتے ہین
اچھی اور بری کو جاننا اور پھر رغبت اور نفرت کا نہ پیدا ہونا یہ جاننا دین مین مسلم نہین، حکیم بھی اگر
محض نام کا حکیم نہین تو ایسی ہی سمجھتا ہے، سقراط سرآمد حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا اور
وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا تھا،

۲۔ پس عام حکمت الٰہی کے موافق جس پر مدار ترقی انسانی ہے، قرآن کو محل تدبر اور تفکر بتایا گیا اور ظاہر کو بتا کر باطن کی طرف متوجہ کیا گیا، خداوند تعالیٰ ہمکو ابتدائی نعمتیں عطا کر کے انتہائی نعمتوں کی طرف رہبری کرتا ہے اور پھر جوں جوں ہم کوشش کرتے جاتے ہیں انعام کے مستحق ہوتے جاتے ہیں، اور یہی عدل ہے ورنہ کیوں فرق مراتب ہے، پس اسی طرح فہم قرآن میں جوں جوں انسان ترقی کرتا جائیگا اُس پر اسرار کھلتے جائینگے اور ایسے نمایاں طور پر کہ وہ اُن کے سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوگا، پس درحقیقت یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ قرآن اپنے دقیق مضامین کے لحاظ سے بھی صاف اور آسان ہے اور اس کا چھپا ہونا محض اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابھی ہم پیچھے ہیں، چنانچہ خود قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ "جو لوگ روشنی قبول کرتے ہیں خدا اونکی روشنی زیادہ کرتا ہے" عام تعلیم میں بھی یہ بات نظر آتی ہے، کیسی ہی صاف تحریر ہو ابجد خوان کے لیے وہ پیچیدہ ہے مگر ایک ماہر کے نزدیک اوسکو پیچیدہ کہنا صریح ظلم ہوگا، قرآن نے اپنی اس صفت کو کہ وہ ایک عمیق اور مکنون کلام ہے خود بتا دیا ہے، پیشانی کتاب پر تین حرف ایسے لکھدیے کہ جن کے معنی ابتک باوجود اس قدر کوشش کے ظاہر نہ ہوے، گویا کہ اس معنوی راہ کے اوّل ہی قدم پر یہ کتابہ لگا دیا کہ ع

ہشدار کہ رہ بردم تیغست قدم را

اور نہ صرف اوّل میں بلکہ اور بھی جا بجا منزلوں کے سرے پر ایسی ہی کتابہ آویزان کردیا کہ مبادا

اگر رہگیر ایک جگہ بھول گیا تو دوسری جگہ ضرور خیال کرے،

۴۔ پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کردیا "اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لیلو" تمام دریا کو اپنی کلھیا مین بھرنے کی ہوس کرو، صحابہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے، اگر کسی جگہ کچھ سمجھ مین نہ آیا، تو خواہ مخواہ اس مین اوجھتے نہ تھے، یہ اسلیے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا، دریا سے عبور کرکے اپنی منزل مقصود کو پہنچتے تھے مگر اوسکی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہین کرتے تھے، کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیدا کنار جانتے گئے تھے، ہان ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوت فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا، اور عام شاہراہ سے ادھر اودھر جو دلکش جزیرے واقع تھے ان کا انکشاف کرتا تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ "اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ ہونگے"،

۵۔ جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہین، اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ بڑھکر سمجھتے ہین، کہ یہ فہم قرآن کیلیے کافی ہے، وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہین،، ان مین سے بعضے اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہین، دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہین، وہ خود گواہی دیتے ہین کہ اسکو سمجھنے کے لیے یہ پہلا امر ہے کہ اوسے ایک اعلی کلام مانا جاوے،

قرآن پاک نے بھی اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اوس کو ہرگز نہین سمجھیگا،" عیسی علیہ السلام سے جب ان کے شاگردنے پوچھا کہ آپ بذریعہ تشبیہات

ٹیون تعلیم دیتے ہین تو یہی فرمایا ”تاکہ یہ بات منکرون پر پوری ہو کہ سنتے ہین اور نہین سنتے اور دیکھتے ہین اور نہین دیکھتے“ قرآن اپنی نسبت کہتا ہے کہ ”اس سے بدکارون کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے“ چنانچہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا کہ حق کو جب ظاہر کیا گیا ہے تو وہ لوگ جو حق کے ماننے کے لیے آمادہ تھے انھون نے بے تکلف اوسے مان لیا اور حق کے راستہ پر چلنا کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ گئے، جس نے پس وپیش کیا اوس نے اپنی منزل کھوئی اور جس نے منھ پھیر لیا وہ اندھا ہو گیا، کیونکہ جس عقل کو وہ ہر کام مین اپنا رہنما بناتا تھا جب اُسی عقل نے حق کی گواہی دی تو وہ اُس سے بیزار ہوا اور کہنے لگا کہ اس کلام مین جادو ہی کہ میری سمجھ الٹی ہوئی جاتی ہے پس عقل پر خواہش کو مقدم رکھا اور لگا فضول شبہے اور بیکار حیلے ڈھونڈھنے تاکہ اپنی حماقت پر ذرا پردہ ڈال دے کیونکہ فطرت کو تاریکی سے خود نفرت ہے پس جب اس نے اس طرح عقل کی آنکھ پر پٹی باندھ لی تو ظاہر ہے کہ جو کچھ رہی سہی روشنی تھی اوسے بھی کھو بیٹھا، اس حالت کو قرآن پاک نے اکثر جگہ بیان کیا ہے اور انجیل مین بھی اس طرف اشارہ ہے،

هو الله

مذهب عشق از همه ملت جداست

عاشقان را مذهب و ملت خداست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ کہ کہ وہ اللہ، بے ہمہ ہے،

۲۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ اللہ باہمہ ہے،

۳۔ لَمْ يَلِدْ ۚ نہ وہ باپ ہے،

۴۔ وَلَمْ يُوْلَدْ ۚ نہ وہ بیٹا ہے،

۵۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ نہ کوئی اوسکی برابری کا ہے،

---

(۱) (وہ) یعنی جسکی ہم بندگی کرتے ہین،

(بے ہمہ) سب سے نرالا، اکیلا

(۲) (باہمہ) سب کا مقصود، سب کا ملجا،

(۳) اللہ کا مفہوم باپ کے مفہوم سے برتر اور محبوب تر ہے،

(۴) بیٹا ہونا زبردستی کے بغیر نہین، اور خدائی مفہوم کے بالکل خلاف ہے،

(۵) برابری: ذات، برادری، (سے پاک ہے، کہ کوئی اس کے جوڑ کا نہین سب مخلوق وہ خالق، سب محتاج وہ تونگر، سب اس کے آگے سربسجود، اور وہ تنہا مسجود، سب باطل، اور وہی تنہا حق،)

(مضمون سورۃ علیٰ سبیل الاجمال)

محبّت

(۱) جس طرح ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جسپر وہ کام ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ایمان اور تعلیم قرآن کی انتہا محبّت الٰہی ہے تمام نبیون کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا، اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے (زیادہ شرح سورۂ فاتحہ مین دیکھنی چاہیئے) قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے، مگر توریت اور انجیل مین بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام مین سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے تو فرمایا "خدا کی محبت تمام دل تمام روح، تمام عقل سے کرنا یہی سب سے اوّل اور اعظم حکم ہے" (متی ۲۲)

اخلاص

(۲) جس طرح محبت الٰہی دین کی غایت ہے، اسی طرح اس محبّت کی جان اخلاص ہے منھ سے محبت کا دم بھرنا اور چیز ہے اور اخلاص محبت اور سے

خلقے زبان بدعوی عشقش کشادہ اند — اے من غلام آنکہ دلش با زبان یکے است

اسی لیے توریت اور انجیل مین اسقدر تاکید سے کہا گیا کہ یہ تمام دل اور تمام روح اور تمام عقل سے ہو، بے شک یہ تعلیم بحیثیت ایک عملی فرمان کے کافی ہے اگر اس کے ساتھ علمی

پہلو بھی ہوتا یعنی یہ کہ ہمین ایسا کیون کرنا چاہیے، تو کچھ اور بڑھانے کی ضرورت نہ تھی قرآن پاک نے اس تعلیم کو مکمل کیا ہے اور اس تکمیل کو اس لیئے اٹھا رکھا تھا کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، آغازِ طفلی مین بچہ کی تعلیم کان اور زبان سے نہین بلکہ آنکھ اور اشارون سے ہوتی ہے، جب وہ سخن آشنا ہوا تو امر و نہی اور امید و بیم کے قریب الوقوع وعدون سے کام لیا جاتا ہے لیکن جب وہ زیورِ عقل سے آراستہ ہوا تو اس سے کسی کام کو بے سمجھے کرنے کی توقع رکھنی عبث ہے، کام کی ذاتی خوبی اور اوسکے نتائج بعیدہ کا ظاہر کرنا ضروری ہوگا، پس محض ایک عملی فرمان اوسی زمانے کے لیے مناسب ہوگا جبکہ عام امت کی عقل ہنوز بچپن کی حالت مین ہو اور نہی کے حکم کو بے سمجھے مان لیتے ہون، جبکہ یہ مناسب ہو کہ بجاے دلائل کے معجزے کام مین لائے جائین، اور جبکہ یہ ضرور ہو کہ معلم کا عصا ہمیشہ انکے سر پر رہے، جبکہ یہ حالت ہو کہ استاد ذرا آنکھ سے اوجھل ہو تو باوجودیکہ عظیم الشان معجزے دیکھ چکے ہون ایک بچھڑے کو خدا بنا لین[1]، جبکہ ناصح شفیق آخری شب مین فرض شفاعت ادا کرنے کیلئے ان سے دعا مین ہمدمی چاہتا ہو تو بچون کیطرح سو سو[2] جائین اور بالآخر وہ یہ جانگاہ فقرہ کہکر کہ "اب خوب سو و" اور نہین ادھورا[3] چھوڑ کر رخصت ہو جائے،

---

[1] بنی اسرائیل کے قصہ کی طرف اشارہ [2] نصاری اور حضرت عیسیٰ کے حواریون کیطرف اشارہ، کہ حضرت کی گرفتاری کی شب مین جب وہ اُنسے اپنی دعا کے ساتھ ہمدمی چاہتے تھے تو وہ سو گئے تھے، [3] حضرت عیسیٰ نے اپنی تعلیم کو "ادھوری" کہا ہے، اور فرمایا کہ جب پیغمبر آئیگا تو آکر ادھوری تعلیم کو پوری کرے گا،

مگر جس وقت بچپن گزر گیا ہو اور عقل کے بلوغ کا زمانہ آگیا ہو، جبکہ معلم اوسکو مکتب سے آزاد کرنا چاہے اور شاگرد کو سندِ تکمیل دیکر استاد بنانا چاہے تو اُس وقت حکم کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہے، اور قواعد کیساتھ حجت کی بھی حاجت ہے تاکہ درختِ عمل آبِ علم سے ہمیشہ سیراب رہے اور قصرِ ہدایت مثل کوہِ راسخ کے ہمیشہ کی مرمت سے بے نیاز ہو جائے، اور جو بشارت کہ حضرت کلیم اور حضرت مسیح علیہما السلام تکمیلِ حکمت کی دیگئے تھے وہ پوری ہو،

عمل کی بنیاد جس وقت علم پر قائم ہو جاتی ہے تو بوجہ استحکام کے اوسکو حکمت کہا جاتا ہے بوجہ اسکے کہ دل اور روح اور عقل سبکو اس سے تشفی ہو جاتی ہے اس کا نام سکینہ اور ایمان ہے، لیکن اگر عمل کی بنیاد علم پر نہین ہے تو وہ نقش برآب ہے، نہ اُسے کوئی معجزہ قائم رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی وعدۂ حور و قصور، اور اگر اس کا وجود بظاہر نظر آتا ہو تو وہ محض سراب کی نمایش ہے،

ع برعکس نہند نام زنگی کافور

قرآن پاک نے مثال دی ہے کہ "ایک پاکیزہ بات مثل ایک پاکیزہ درخت کے ہے جسکی جڑ مضبوط ہو اور شاخ آسمان مین ہو خدا کے حکم سے ہر وقت میوہ دیتا ہو" یعنی کلمۂ حق دل و جان مین پیوند ہو کر ہمیشہ اپنا نتیجہ شیرین بخشتا رہتا ہے،

تکمیلِ علم کیلئے معرفت اور حجت کی ضرورت

(۳) جس طرح عمل کی بنیاد علم پر ہے، اوسی طرح علم کی بنیاد، معرفت اور حجت پر ہے، یعنی ٹھیک پہچاننا اور سمجھکر ماننا یا ذ سادہ لفظون مین "کیا" اور "کیون" کا جواب معلوم کرنا "کیا" کا صحیح جواب معرفت ہے اور "کیون" کا صحیح جواب حجت، معرفت سے صحیح تصور حاصل ہوتا ہے اور حجت سے صحیح تصدیق،

قرآن پاک اپنے طرزِ بیان سے بھی اکثر یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ صحیح تصور کا نتیجہ صحیح تصدیق ہے، اور صحیح تصدیق کا ضروری نتیجہ درستی عمل ہے، چنانچہ ہمیشہ ایمان کے ساتھ عمل کو بطور نتیجہ کے ذکر کیا گیا ہے، تاکہ اگر عمل اس سے پہلو بہ پہلو نہین تو سمجھ لو کہ ایمان بھی برائے نام ہی ہے یہودیون کے دعوائے ایمان اور نافرمانیون کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا کہ کیا کچھ برائیان تم سے ایمان کروا تا ہے اگر (اگر مان لین کہ) تم مومن ہو (سورہ بقر) یعنی تمھارا دعوی ایمان غلط ہے، اور اس ایمان کو ایمان کہنا تمھاری ہی اصطلاح ہے جسکو حقیقت سے کوئی واسطہ نہین، اور اس نام کے ایمان سے کیسی کچھ نالائقیان سرزد ہوتی ہین،

فائدہ معرفت

معرفت علم کی ابتدا ہے یعنی جب تک کسی شی کو یہی نہ جانو کہ وہ ہے کیا اوسوقت تک اوسکے

متعلق اور کیا علم حاصل کرسکو گے، کیونکہ اگر ابتدا مین ذرا بھی کجی رہی تو ہر ایک قدم پر اصلی علم سے دور ہوئے جاؤ گے، اور تاریکی پر تاریکی چھاتی جائیگی، بنیاد کی غلطی ذرا بھی ہو تو بھی بہت بڑی ہے ایک ہی نقطہ سے دو خط کھینچو جنمین بال برابر فاصلہ ہو پھر دیکھو کہ جون جون وہ دونون آگے بڑھتے جائینگے اُن مین فاصلہ زیادہ ہوتا جائیگا،

خشت اول گر نہد معمار کج — تا ثریا میرود دیوار کج

لوگون کو یہ کہتے سنا ہے کہ تمام مذاہب باوجود اُن کے باہمی سخت اختلافات کے ایک ہی مرکز پر پہنچتے ہین، یہ بات ایک پہلو سے صحیح بھی ہے مگر دوسرے پہلو سے بالکل غلط اور اکثر لوگ اسی غلط پہلو کو سمجھتے ہین۔ مذہب کی ابتدا بیشک ایک ہی ہے مگر اُن کے انتہا مین مثل انھین دو خطون کے جو ایک نقطہ سے نکلے ہون بے انتہا فرق ہے۔ ایک ہی شہر سے دو مسافر چلے ایک نے پچھم کو رُخ کیا دوسرے نے اُتر کو، یہی حال اختلاف مذاہب کا ہے، اسی لیے اگر کوئی شخص ہر مذہب مین سے جزئیات اور زوائد کو دور کرنا چاہے اور محض ان کے کلیات اور اصول تک پہنچے تو وہ سب ایک معلوم ہون گے، مگر یہ وہی کرسکتا ہے جو تقلید سے بالکل پاک ہو اور نہ صرف آبائی مذہب کا بلکہ ہر ایک مذہب کا ایک وقت منکر ہو، یہ لیک ایسا مشکل کام ہے جس کا متحمل شاید ہی کوئی نیک دل شخص ہو۔ تقلید کی حالت مین وہ اصل اور زوائد مین فرق نہین کرسکے گا، اور اس فرق نہ کرنے سے اختلافات پیدا ہوگئے (زیادہ شرح فقرہ ۲۸ مین ہے)

فوائدِ محبّت

(۴) محبت کا علم اگرچہ معرفت کے علم پر مبنی ہے، مگر اوّلاً انسان محبت ہی کی جستجو کرتا ہے، اور اسی کے لیے معرفت کو ڈھونڈتا ہے، پھر محبت کا بڑا فائدہ یہ ہے، کہ عمل میں استقلال اور خلوص پیدا کرتا ہے، پس "معرفت" اور "محبت" ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں، گویا کہ مرغِ عقل کے دو پر ہیں جنہیں سے اگر ایک ٹوٹ جائے تو پرواز محال ہو جائے گی، اس نہایت ضروری بحث کو مثال سے واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ "نماز بے شرمی اور بے عقلی کے کاموں سے روکتی ہے" یہاں یہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں "نماز" کیا ہے (فرض کرلو کہ بے شرمی اور بے عقلی کے متعلق تم کو تسلی ہے کہ وہ کیا ہیں) دوسرا سوال یہ ہے کہ "کیوں" یہ بات نماز میں ہے، اگر تم نے یہ دونوں سوال ٹھیک طور پر حل کر لیے تو کوئی شبہہ نہیں کہ تمھاری نماز ٹھیک نماز ہو گئی، اور وہ ضرور تمھیں اون کاموں سے باز رکھیگی، اور تم ہرگز نماز کو ترک نہ کروگے، کیونکہ اون کاموں سے بچنے کی خواہش تمھاری فطرت میں موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ "ایمان والوں کو خدا سب سے پیارا ہے" خدا کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ کیوں پیارا ہے؟ اگر یہ سوالات صاف طرح پر حل ہو جائیں، تو تم سچے مومن ہو جاؤگے اور خدا تم کو سب سے زیادہ محبوب ہوگا،

اور پھر یہ محبت دل سے ہرگز نہین نکلے گی۔ اب خیال کرو تو معلوم ہوگا کہ "کیون" کا پتہ "کیا" سے ملتا ہے یعنی جاننا پہچاننے سے حاصل ہوتا ہے، اگر تم کو ٹھیک طور پر یہ معلوم نہ ہووے کہ خدا، کیا ہے اور ایمان کیا ہے، اور پیار کیا ہے تو یہ بات ہرگز نہ معلوم ہوگی کہ خدا کیون ایمان والون کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اور جب یہ نہ معلوم ہوا تو خدا کی محبت کا حاصل ہونا بھی معلوم "کیا" اگرچہ "کیون" کی گرہ کھولتا ہے مگر اول دل مین "کیون" ہی کا سوال پیدا ہوتا ہے، اگر یہ سوال پیدا نہ ہو تو "کیا" کی جستجو نکیجائے، انسان کی تمام ترقی اسی ایک سوال مین چھپی ہے، اور انسان اور دوسرے جانورون مین یہی چیز فرق پیدا کرتی ہے، فہم و تمیز حکمت دانائی غرض دین دنیا کے خزانون کی کلید یہی دو چیزین ہین،

قرآن حجت و حکمت کیطرف رہبری کرتا ہے،

(۵) گذشتہ بیان سے یہ تو ظاہر ہوگیا کہ معرفت اور حجت کی دین مین کسقدر سخت ضرورت ہے، اور ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار اسی پر ہے، اس پر زیادہ بحث کرنا فن منطق کا حصہ ہے، جس کے لیے یہان گنجایش نہین، مگر یہ بات بے شبہہ اس سے معلوم ہوگئی کہ قرآن پاک کیون اس قدر غور و فکر و تدبر کی تاکید کرتا ہے اور کیون یہ فرماتا ہے کہ "جسکو حکمت دیگئی اوس کو بہت سی نعمتین دیگئین" اور کیون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت

مین بار بار کہا گیا کہ وہ اُن کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیگا اور کیون حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت مین آیا ہے کہ "ہم نے یہ حجت ابراہیم کو بخشی" اور اسکی مثل بہت سی آیتین ہین۔

ضرورتِ اخلاص

(۶) یہ بات تو اب معلوم ہو گئی کہ دین مین صداقت اور خلوص کسقدر ضروری ہے اور یہان جھوٹ کی ذرا آمیزش بھی زہر ہے۔ اسی لیے قرآن پاک اکثر یاد دلاتا ہے کہ خدا سے تعالے دلون کی سب چھپی ڈھکی دیکھتا ہے۔ اب اس خاص مسئلہ محبت الٰہی کو دیکھو۔ اسمین سب سے زیادہ اخلاص کی ضرورت ہے۔ اور دہرے اخلاص کی یعنی جب تمام دل اور عقل اور روح کو اوسی کی محبت کے نذر کر دیا تو پھر ہمارے پاس کیا بچا۔ پس یہ تو ہماری طرف سے اخلاص ہوا یعنی جو کچھ پاس تھا سب دیدیا۔ اب اوس طرف سے دیکھو کہ اگر وہ تنہا نہین بلکہ اسکے ساتھ اور بھی کوئی لگا ہوا اور دوئی کی بو باقی ہے تو پھر یہ دعوےٰ کہ ساری کی ساری نذر اوسی ایک کو دی غلط ہو گا۔ اب اس دہرے اخلاص کے حکم کے ساتھ اوسکی ایسی صفات کا بتانا ضرور ہے جس سے معلوم ہو کہ ہمین کیون ایسا کرنا چاہیئے۔

ضرورت سورۃ اخلاص

(۷) پس اگر دین کی غرض محبت الٰہی ہے اور اگر اس محبت مین سچائی اور ثبات

کی ضرورت ہو تو کوئی شبہہ نہین کہ اس کے لیے معرفت اور محبت کی بھی سخت ضرورت ہے،

اب اگر تھین اس ضرورت کا احساس ہے تو سورۂ اخلاص پر غور کرو۔ اگرچہ یہ سورہ اپنے

ظاہری انداز کے لحاظ سے تمام سورتون مین ایسی چھوٹی ہے جیسی تمام بدن مین آنکھ کی تپلی

مگر سارا عالم ہدایت اسی سے روشن نظر آتا ہے، محبت الٰہی کے لیے جس معرفت اور محبت کی

حاجت ہے وہ ان چند آیتون مین بکمال خوبی ظاہر کیا گیا ہے، اور وہ محبت کی روشنی

اور گرمی جو تمام قرآن مین پھیلی ہوئی ہے وہ یہان ایک نقطہ پر مجتمع ہو گئی ہے اگر دیگر

مذاہب والے اس سورہ کو مان لین جسکا ماننا اُن پر عقل کے رو سے لازم بھی ہے تو گمراہی

کی تمام ظلمت کافور ہو جائے اور دنیا خدا کے نور سے معمور ہو جائے جیسا کہ ہے بھی، اگر دیکھین

چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ خدا آسمان اور زمین کا نور ہے (سورۂ نور)

مسلمانون کے نزدیک یہ سورہ ثلث قرآن ہے (اسکی شرح فقرہ ۔ ۔ ۔ ۔ مین دیکھنی چاہیے) اگر یہ

سورہ توریت یا انجیل مین ہوتی تو نصاریٰ ہرگز تثلیث کی مہلک بیماری مین نہ پڑتے اور کو

اپنی تاریکی کے زمانہ مین اس سورہ سے اسقدر ضد تھی کہ وہ اگر کسی کو اپنے مذہب مین داخل

کرتے تو اوس سے، نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کرواتے جس کی صفت اس سورہ مین

بیان کی گئی ہے، مگر روشنی تاریکی پر ضرور غالب ہوتی ہے، چنانچہ ایک تو وہ زمانہ تھا

اور ایک اب زمانہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سورہ کو تسلیم کرتا ہے اور مجمع نصاریٰ مین شہادت

دیتاہے کہ قرآن بیشک آسمانی کتاب ہے، اب یہ امر دیکھنا ہے کہ کیونکر ہم کو اس سورہ سے محبت الٰہی کے لیے کافی علم یعنی معرفت اور حجت، پہچاننا اور ماننا، کیا اور کیون حاصل ہوتا ہے، اس کے لیے اوّل ہم کو اوسکے الفاظ کو دیکھنا چاہیے کہ وہ "کیا" معنی رکھتے ہین، اور پھر "کیا" سے "کیون" ظاہر ہوجائے گا،

مضمون الفاظ سورہ

(۸) "وہ اللہ ہے" یعنی جس کی ہم بندگی کرتے ہین وہ اللہ ہے، قرآن پاک نے اس مقدس نام (اللہ) کا مفہوم اچھی طرح بیان کردیا ہے، چنانچہ اس کلمہ سے مسلمانون کے نزدیک وہ ذات پاک مراد ہے جسمین تمام کمالات و محاسن جمع ہین، اور تمام نقائص سے پاک ہے، اس سے اعلیٰ توکیا اس کے برابر بھی کوئی نہین، اور یہ معانی خود اس کلمہ مین مضمر ہین اور اکثر مواقع پر قرآن پاک نے بعد اسم اللہ کے بطور تشریح کے ایسے اسمار کا ذکر کردیا ہے، جن سے ان معانی کی طرف رہبری ہوتی ہے (معنی اسم اللہ ملاحظہ ہو ص ۱۹)

اگر کسی دہری کو شبہہ ہو کہ یہ مفہوم کیا ثبوت ہے کہ وجود بھی رکھتا ہے؟ یہ تمھارا اپنا بنایا ہوا خیالی ہے، ایسی کوئی ذات نہین جو تمام صفات کمال کی جامع ہو تو ہم اس سے کہین گے کہ یہ مفہوم قرآن کی مختلف آیتون سے لیا گیا ہے، جنمین اس دعوی کے دلائل بھی موجود ہین، یہان صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارا معبود وہ ہے جو جامع صفات کاملہ ہے، اور اس سے جو

ضروری نتیجے نکلتے ہین اُن پر آگاہ کرنا ہے، پس اسم مقدس کیساتھ خیال کمال لازم ہی، اور چونکہ قرآن پاک مین اس اسم کی شرح مین دلائل کا ذکر بھی موجود ہی تو ہمارے دل مین یہ کلمہ مقدس اُن تمام دلائل کو بھی حاوی ہے جو اس کے ساتھ مذکور ہین، لیکن تاکہ عذرِ نافہمی باقی نہ رہجائے اس اسم مقدس کے بعد بطور تفصیل کے وہ صفات بیان کئے ہین جنسے یہ شبہہ اور دیگر شکوک بھی بالکل دور ہو جاتے ہین''

(۹) نہ صرف عرب بلکہ اکثر اقوام کے نزدیک ایک سب سے بڑے معبود کا خیال تھا اگرچہ نافہمی سے اوسکی بڑائی کا جیسا کہ زیبا ہے لحاظ نہ رکھنے سے شرک مین مبتلا ہوتے تھے (اور یہی خیال اُن پر حجت الٰہی ہے کہ اونکی عقل کیون اولٹی ہو گئی کہ باوجود اقرار کمال الوہیت و تسلیم خدائے مطلق اس کے درگاہ مین دوسرے کا بھی دخل سمجھتے ہین، عاجزی اور فروتنی جو لازمۂ عبودیت و مخلوقیت ہے، اوسے بھولکر بعض بندگانِ خدا کو پوجنے لگتے ہین گویا یہ بندگی کی حد سے اوپر ہین) پس عام عرب اس اسم مقدس اللہ کے مفہوم سے بالکل ناآشنا نہ تھے، البتہ اوس کے اس مفہوم کی وسعت و گہرائی سے غافل تھے اور اس لیے اُس سے دور جا پڑے تھے۔ قرآن نے اس مفہوم کو اچھی طرح پر ظاہر کر دیا اور بتا دیا کہ اس کے لوازم سے غفلت کرنا درحقیقت اُس کا انکار کرنا ہے، جب اس طرح سے مفہوم اس مقدس نام کا معلوم ہو چکا تو بتایا گیا کہ وہ جسے ہم پوجتے ہین، اللہ ہے یس یہ ایک کلمہ ہزار کلمہ کے برابر ہو گیا، مثلاً اگر یہ بتا دیا گیا ہو کہ بادشاہ کے یہ یہ اوصاف ہین تو کسی کو

اس کہنے کی جگہ کہ وہ چنین اور چنان ہے، یہ ایک لفظ کہدینا کافی ہے کہ وہ بادشاہ ہے،

ضرورت تفصیل معنی "اللہ"

اگرچہ جہان غلطی سے بچانا یا کسی بات کو زیادہ دلنشین کرنا ہوتا ہے وہان اجمال کے بعد تفصیل مفید ہوتی ہے، اور چونکہ توریت اور انجیل مین خدا کے صفات مذکور تھے باانہمہ نصاری غلطی مین پڑگئے، اور اسی طرح مشرکین بھی خدا کو سب سے اعلی مانتے تھے، پھر بھی فرشتون کو اسکے ساتھ برابر کا نہ سہی تو چھوٹے درجہ کا شریک بناتے تھے،

اس تفصیل کی سخت ضرورت تھی، نیز اس تفصیل کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انکو معلوم ہو کہ وہ درحقیقت خدا کو نہین پوجتے اور محض جھوٹا دعوی کرتے ہین، تاکہ وہ متنبہ ہون کہ شرک نے اُن کو بالکل خدا سے منقطع کر دیا، چنانچہ اسی مضمون کو ان سے بوقت ہجرت اور قطع تعلق کے کہا گیا تھا (سورہ قل یا ایہا الکافرون مین اسکی بحث ہے) کہ تمھارا خدا اور ہے اور ہمارا خدا اور، اب یہان یہ کہدینے سے کہ ہمارا معبود اللہ ہے ظاہر کر دیا، کہ وہ لوگ دوسرا معبود رکھتے ہین پس اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ وہ محبت الہی سے بالکل محروم ہین، اسم مقدس کے مفہوم کو مفصل بیان کیا، تاکہ وہ اپنی حماقت کو سمجھکر راہ راست پر آوین، یہی وجہ ہے کہ یہان وہ اسلوب بیان اختیار کیا جو غلطیون کو براہ راست دور کرتا ہے، پس اگر خیالات باطلہ سے قطع نظر کیجائے تو صرف ھو اللہ کافی ہے، اس سورہ کا مرکز یہی ہے، اگرچہ اُسکا

ہر فقرہ دلربا ہے۔

شرحِ احد

(۱۰) اس تفصیل مین پانچ باتین بیان ہوئین "بے ہمہ ہے" کوئی نہین تھا تب بھی وہ تھا۔ اور اب بھی ویسے ہی بے ہمہ ہے کلمہ "احد" جس کا ترجمہ عربی "بے ہمہ" کیا گیا ہے، عربی زبان مین صرف ذات پاک کی صفت مین مستعمل ہوتا ہے اس سے یکتائی اور بے ہمتائی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ تمام رشتہ سے پاکی اور برتری اس کا مضمون ہے اس کلمہ کو سرسری نظر سے دیکھنا غلطی ہے۔ بنظر تدبر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب مخلوق ہین کیونکہ جو سب سے پہلے آپ ہی آپ تھا، وہ ہمیشہ سے تھا، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ جو کبھی نیست تھا وہ خود تو ہرگز ہست ہو نہین سکتا؛ اسلئے دو بات ماننی ضرور ہوئی، ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے، اور دوسری یہ کہ اوس کے سوا جو ہین وہ سب اوسی کی مخلوق ہین "بے ہمگی" کے یہ دو ضروری نتیجہ ہین جنکا انکار کرنا خلافِ عقل ہے، پس یہ کہنا کہ وہ بے ہمہ ہے یہ کہنا ہوا کہ وہ قدیم لم یزل اور خالق کل ہے،

(۱۱) مشرکین کبھی یہ شبہہ ظاہر کرتے ہین کہ ہم کیونکر مان لین کہ وہ معبود بے ہمہ ہے، اگر اس کے سوا کوئی اور بھی قدیم ہو تو بے ہمگی کا دعوی غلط ہوگا، اس سوال کے جواب کے لیے چند باتون پر غور کرنا ضرور ہوگا، (۱) تمام طاقتون کا مدار ہستی پر ہے غیر متناہی

طاقت متناہی ہستی سے تناقض رکھتی ہے، عقل کے نزدیک "بقا" ایک ایسا اعلیٰ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس کے سامنے سب مرتبے ہیچ ہین، اگر "فنا" ناتوانی کی نشانی ہے تو "بقا" کمالِ توانائی کی شہادت ہوگی، (۲) اگر چند قدیم مانے جاوین تو ان مین سے کوئی بھی غیر محدود طاقت نہ رکھیگا، ملکِ قدرت تقسیم ہوجائیگا، اور اسی طرح ملکِ تصرف بھی ہر ایک کو ایک نئے عالم پر حکومت کرنی ہوگی ہے

یک ملک دو شاہ بر نتابد

اگر ایک کا تصرف ہوا پر ہوگا تو دوسرے کا پانی پر اور تیسرے کا آگ پر اور علیٰ ہذا القیاس دو چار نہین بلکہ جتنے چاہو خدا مان لو، (۳) عقل ہرگز دو متناقض باتون کو تسلیم نہین کرتی ایک ہی ذات کو محدود اور غیر محدود، کامل اور ناقص دونون فرض نہین کرسکتی، اب بنظر تامل دیکھو کہ قدامت کو لازم ہے کمال اور کمال کو لازم ہے یکتائی، پس قدیم کو متعدد کہنا نقیضین کو جمع کرنا ہے،

(۱۲) دہری کو یہ کہتے سنا کہ کچھ بھی قدیم نہین، زمانہ کی گردش مین شام اور صبح یا رات اور دن، گرمی اور سردی، موت اور زندگی یکے بعد دیگرے چکر لگاتی رہتی ہین، اور یہ چرخہ یون ہی چلتا آیا ہے اور چلتا جائے گا، اسی کو چاہو باقی کہو اور چاہو فانی، کاش دہری کی عقل اس گردش کون و فساد کو دیکھ کر خود چکرا نہ جاتی، اگر پائے فہم

ٹرلکھڑایا تھا تو زرازانوے فکر پر سر رکھا۔ اور سوچا کہ یہ کیا راز ہے کہ جو چیز اپنے تئین فنا سے بچا نہ سکی وہ فنا ہو کر کیونکر آسکی؟ ذرا سا تخم سڑکر درخت تناور ہو گیا اور ایک تخم نے لاکھون بلکہ بیشمار تخم اور درخت بنا دیئے۔ ایک دانۂ بے حقیقت کہ جس کو جہان چاہو پھینکدو اور جب چاہو برباد کردو پیوند خاک ہو کر پہلے تو فنا ہو گیا اور پھر کیا سے کیا ہو گیا۔ خود اپنے ہی آغاز اور انجام کو دیکھا کہ کیسا بے نام و نشان تھا اور بزعم خود ہمہ دان ہو گیا مگر کیسی بیچارگی ہی کہ

لائی حیات آئے، قضا لیچلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

پھر کیونکر اس امر پر عقل تسلی پا سکتی ہے، کہ تمام نظام عالم جسمین ذرہ ذرہ ایک کارخانۂ حکمت ہے، بغیر کسی حکیم قادر کے چل رہا ہے، خود ہی بیچارگی کے ساتھ آتے اور جاتے ہین اور کوئی ان پر حاکم نہین، اگر تم کسی نئے شہر مین گذرو اور دیکھو کہ ہر کام نہایت محنت اور مشقت سے لوگ کرتے ہین اور ہر کاریگر زبردستی آتا اور زبردستی جاتا ہے کوئی اس شہر کا مالک یا باشندہ نہین تو کیا تمھین خیال نہین پیدا ہو گا کہ یہ شہر کسی کے تصرف مین ہے جو ان مزدورون کو یہان برابر بھیجتا رہتا ہے، پس یہی مثال ہے انسان اور حیوان کے زندگی کی جو بظاہر مختار اور متحرک بالارادہ ہین، اور جنمین اس بات کی علامت پائی جاتی ہے کہ یہ کسی حاکم کے زیر فرمان نہین اور جب اُن کا یہ حال ہے تو وہ چیزین جو بالکل مسخر ہو کر برابر اپنے کام مین

لگی ہین انھین کیونکر کسی حاکم کے ماتحت نہ سمجھا جائے ،

(۱۳) جس طرح اوسکی اوّلیّت سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ سب کا خالق ہے، اسی طرح سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ تمام نعمتین اوسی کی بخشش ہین پس وہ سب سے بے نیاز ہوا اور سب اوسکے نیازمند ہوئے اور تمام خوبیان جو کہین بھی پائی جائین اُن کا مبدء اور اصل وہی ذات پاک ٹھہری، اسلیے ہر ایک حاجتمند اور حسن پرست کا رُخ اودھر ہی ہونا چاہیے،

اسم اللہ کا مفہوم باپ مان کے مفہوم سے بدرجہا ارفع ہے

(۱۴) اسی اوّلیت سے یہ بات بھی صاف ظاہر ہو گئی کہ جس قدر ہماری ذات کیساتھ رشتے بندھے ہین، مثلاً والدین، اولاد، خویش اقارب، دوست محسن وغیرہ ان سب کے علائق بمقابلہ اس تعلق کے جو ہمکو خداے پاک کیساتھ ہے بالکل ہیچ ہین، عارضی، بے ثبات، اور پھر طرفہ یہ کہ اسی خدا کے بخشے ہوئے، پس بالکل خلاف عقل و خلاف انصاف ہوگا کہ ہم اس اعلیٰ نسبت کو زیادہ سے زیادہ باپ کے رشتہ کے برابر سمجھین، ہان باپ کا تصور ایک ناقص مثال اوس اللہ (ہمہ مہر) کی ہو سکتی ہے اور مذہب کی ابتدائی الف بے سیکھنے کے زمانہ مین اس سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے، مگر جب اس اسم مقدس کا اعلیٰ فہم دیدیا گیا تو پھر اوسکو باپ باپ کہتے رہنا صرف اسی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ باپ سے اعلیٰ مفہوم نہین سمجھا، یعنی اللہ کا مفہوم نہین پایا، ایسی احمق وہ لڑکی ہوگی جو عروسی کے وقت بھی اوسی گڑیون کے کھیل مین محو رہے، نہ

اس نے اب تک نہین جانا کہ دولھا کسے کہتے ہین، یہی وجہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس کوئی لفظ نہین جسکو اسم مقدس کہین وہ ایک ہی لفظ کو اللہ اور فرشتہ اور حاکم اور امیر کے لیے استعمال کرتے ہین، جب وہ مریم علیہا السلام کو خدا کی مان کہتے ہین تو ہمارا دل تھرّا جاتا ہے، اللہ اکبر، کجا شان کبریائی اور کجا یہ کودکی، اگر اسم مقدس کے مفہوم کو جانتے تو ہرگز یہ کلمہ ان کی زبان سے نہ نکلتا۔

(۱۵) لیکن باوجودیکہ ہمارے لیے یہ تعلق تمام رشتون سے زیادہ دلپسند ہے کہ ع

ہم اس کے ہین ہمارا پوچھنا کیا

تاہم اوسکی "بے ہمگی" کا مفہوم ہم کو مغرور نہین ہونے دیتا۔ اوسکی بے غرض اور بے انتہا رحمت کا شکر کرتے ہین مگر اوسکو درجۂ الوہیت سے اتار کر باپ بھائی نہین بناتے "بے ہمہ" سے جو مفہوم سب سے اول ذہن مین آتا ہے وہ یہی ہے، دوسرے مفہوم اوس کے بعد ذہن مین آتے ہین اور اس لیے گمراہی کا رستہ پہلے سے بند کر دیا ہے۔

(۱۶) پس جو مفہوم کہ اسم مقدس اللہ کے اندر کبریائی اور اولیت اور خالقیت مطلقہ اور رحمت عامہ اور حقیقی محبوبیت کا تھا وہ سب اس کلمہ سے سمجھا گیا، اور یہ معانی اوس سے درجہ بدرجہ حاصل ہوے ہین، اسی لیے پہلے معنیٰ کے سوا دوسرے معنی اس لفظ سے بغیر تفکر اور تدبر کے سمجھ مین نہین آتے، مگر قرآن ہم کو تاکید کرتا ہے کہ تدبر اور تفکر سے کام لو،

اور بیشمار آیتون مین اسکا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ عقل کی عبادت یہی ہے کہ سوچے، (التفکر عبادۃ العقل)

شرح الصمد

(۱۷) بعضے وہ معنی جو بے ہمہ مین جھلکتے تھے اور اس سے بتدبر سمجھے جاتے تھے اُسے باہمہ نے روشن کردیا، محض اوسکی "بے ہمگی" اور بے نیازی کو خیال کرکے بعضے لوگون نے تنگ نظری کی وجہ سے اوسکی بیشمار نعمتون پربھی کچھ توجہ نہ کی اور اُسے ایک بے پروا گوشہ نشین علت العلل سمجھ لیا پس اون کی غلطی دور کرنے کے لیے اوسکی باہمگی کی تصریح کی حاجت ہوئی (خود بیشک بے نیاز ہے، مگر سب کی دستگیری اور خبرگیری کرتا ہے نصرت اور مدد اور تسلی کا اعلیٰ قبلہ کوئی اوس کے سوا ہو ہی نہین سکتا، تمام قوت اور تمام احسان کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ جب مانگو عطا کرتا ہے، مانگنے کی خواہش بھی وہی بخشتا ہے، یعنی بلوا کر بخشش کرتا ہے، بلکہ بن مانگے دیتا ہے لیکن اگر کوئی قبول نہ کرے تو یہ کام اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے بندگی تو تمھین کروگے تمھاری طرف سے وہ بندگی نہین کرسکتا، اور تعجب آتا ہے کہ کیونکر نصاری مانتے ہین کہ اس نے خود اپنے تئین ہمارا کفارہ کردیا، اگر یہ ممکن ہوتا تو ہماری طرف سے نیکی کردیتا بلکہ اپنی بے انتہا نیکیون کو ہمارا کفارہ بنا دیتا،

لغوی معنی الصمد

(۱۸) کلمہ صمد جس کا ترجمہ باہمہ کیا گیا اصل وضع مین بڑی چٹان کو کہتے ہین، اور چونکہ دشمنون کے حملہ کے وقت اسکی پناہ پکڑتے ہین اس لیے سردار کو جو قوم کی پشت پناہ ہو اور سب لوگ اوسی کی طرف متوجہ ہون صمد کہنے لگے، زبور اور دیگر کتب مقدسہ مین خدائے تعالیٰ کو اکثر چٹان مدد کی چٹان کہا گیا ہے (اسکی سندین اصل کتاب نظام القرآن مین ہین)

بلاغت ترکیب صفت احد و صمد

۲ احد (بے ہمہ) اور صمد (با ہمہ) دو ثبوتی صفتین ہین، اور بظاہر متقابل ہین، مگر خدائے پاک کی تمام صفتین ایک ہی ذات کے مختلف مظاہر ہین، ایک پر غور کرو تو دوسری سب اسمین شامل ہو جاتی ہین مختلف صفات سے اوسکو مرکب سمجھنا غلطی ہے، پس جو کچھ تقابل ہے وہ بنظر ظاہر ہے جیسا کہ بہمہ کی تفسیر مین بیان ہو چکا، احد، اور صمد دو صفتون کے ساتھ ساتھ ذکر کرنے سے ظاہر طور پر اُن شبہون کو دور کر دیا جو راہ مستقیم سے ادھر اودھر ہٹا سکتے تھے، اور ان بظاہر متقابل صفتون کو مثل دو آئینہ متقابل کے یکجا کر کے معرفت الٰہی کا جلوہ کامل دکھلا دیا، در حقیقت چونکہ وہان دوئی کا شائبہ نہین ہے اس لیے ان دونون صفتون کو ایک ساتھ تصور کرنا اور دونون کے

اثر سے جو حالت معتدل بین الخوف والرجا پیدا ہوتی ہے اس پر ثابت رہنا نہایت مشکل کام ہے صفات باری مین تقابل کو جمع کرنا اسلیے مشکل ہے کہ اوسکی ہر صفت غیر متناہی ہے اور اسی وجہ سے مجوسی کی عقل اوس کی متحمل نہ ہوئی اور دو خدا مان لیے اور ہنود نے بالضرورت تین فرض کر لیے، زندگی بخشنے والا، زندہ رکھنے والا، زندگی لینے والا، مگر جب دوئی آئی کمال جاتا رہا، کمال کے ساتھ بقا بھی رخصت ہوئی، پس ایک خیال خام کو خدا بنا لیا، جسکا کچھ بھی وجود نہین، معدوم محض سے جی لگا کر ہلاکت کے سوا اور کیا ملسکتا ہے۔

وہ کسی کا باپ نہین،

(۱۹) یہ بات تو ظاہر تھی اور جو پہلے بیان کیا گیا اس مین موجود تھی مگر منظور تھا کہ شرک کی پرچھائین ہر ایک گوشہ تنگ سے نکال دیجاے اور وہ بھرپور روشنی جسکے لیے یہ کتاب نازل ہوئی تمام عالم کو بخشی جائے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السّلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دینے کے ساتھ یہ بھی بیان فرمایا کہ "مجھے اور بہت سی باتین بتانی تھین مگر تم ابھی اس کے متحمل نہ ہو سکو گے، ہان جب وہ روح حق آویگا، تمھین تمام حق کا راستہ دکھلاویگا، کیونکہ وہ اپنی طرف سے نہین بولیگا بلکہ جو کچھ سنیگا وہی کہیگا، اور آنے والے امور کی تمھین خبر دیگا" یوحنا ۱۶: ۱۳ اسی لیے قرآن نے حق کے کھولنے مین کوئی دقیقہ نہین رکھا، تا کہ گمراہون کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہجائے اور باطل کو کہین منھ چھپانے کی جگہ نہ ملے۔

(۲۰) پہلی شریعتون مین ہدایت بقدر تحمل دیگئی تھی، جیسا کہ ابھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام مین اسکی تصریح گذری اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنحضرتؐ کی بشارت کے موقعہ پر یہودیون کو بتایا کہ تم نے خود کامل بننا نہین چاہا تو خدا نے بھی تمپر زیادہ بار ڈالنا پسند نہین کیا اور فرمایا کہ "مین ان کے بھائیون مین سے ایک نبی مثل تیرے پیدا کرونگا اور اپنا کلام اوس کے منھ مین ڈالونگا، پس وہ انھین تمام میری ہدایتین سنائیگا (استثنیہ ۱۸: ۱۸) چنانچہ اس آخری نبوت مین ہدایتین اتمام کو پہنچائی گئین، اور اسی بنا پر یہان صاف دیکھتے ہو کہ توحید کی تعلیم کس قدر خالص اور روشن کردیگئی ہے

(۲۱) ہم کو محسوس نہین ہوتا کہ یہ نکتہ کیون گذشتہ امتون کے فہم سے بالاتر تھا مگر دوسری امتون سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سبق انھین اب بھی بہت مشکل نظر آتا ہے، مشہور مورخ گبن کی شہادت کا یہان نقل کرنا کافی ہوگا، وہ کہتا ہے. محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اعتقاد گمان اور شبہہ سے پاک تھا اور قرآن خدا کی توحید کی ایک عالیشان گواہی ہے. نبی مکی نے بتون کی، اور انسانون کی، ثوابت کی، اور سیارون کی پرستش کو اس عقلی اصول پر باطل کردیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب ہوتا ہے اور جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ہے، اور جو چیز بگڑ سکتی ہے وہ ضرور فنا ہو کر رہیگی، خلاق عالم کی پرستش

اوسکی عاقلانہ محبت نے اس اقرار کیساتھ کی کہ وہ غیر متناہی اور قدیم ہے، صورت اور مکان سے منزہ ہے، نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ مشابہ، ہمارے چھپے سے چھپے خیالات پر مطلع اپنی ہی ذات سے واجب الوجود، اور اپنی ہی ذات سے علم اور نیکی مین کامل ان اعلی حقائق کو جیسا کہ اس نبی نے فرمایا اوسکی امت دل سے مانتی ہے اور قرآن کے مفسرون نے اون کے معانی حکیمانہ درستی کیساتھ بیان کئے ہین، ایک فلسفی موحد تو مسلمانون کے عام عقیدہ کو تسلیم کرسکیگا، مگر شاید ہم لوگون کی موجودہ فہم سے یہ بہت بلند ہے" گبن نے تو نہایت صفائی سے اقرار کیا کہ یہ اعلی اور صحیح مفہوم اسم مقدس اون کی فہم سے برتر ہے مگر علمائے تمام نصاری اور دیگر مذاہب والے اقرار کر رہے ہین کہ ان کو ہنوز اس مفہوم تک رسائی نہین ہوئی، کاش قرآن کی روشنی کو قبول کرتے اور بہ عوض جاہلانہ اور پست عقیدہ کے حکیمانہ اور بلند عقیدہ اختیار کرتے،

شرک تقاضائے فطرت نہین،

(۲۲) بت پرستی اور مردہ پرستی کا غلبہ عام طبائع پر دیکھکر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟ اور کیا خدائے پاک کی خالص پرستش عقل انسانی سے بالاتر ہے؟ کیون نصاری پر ہنوز چھ صدیان نہین گذرنے پائین کہ تصویر پرستی اون مین جاری ہو گئی، حالانکہ توریت مین سخت ممانعت تھی؟ اور کیون یہود باوجودیکہ توریت کا

پہلا حکم توحید تھا بارہا دل کھولکر بتون کو پوجنے لگے ؟ اور کیون باوجودیکہ ابراہیم نے محض توحید کیلیئے وطن چھوڑا اور ایک سنسان جگہ جا بسے لیکن انہین کی اولاد نے کچھ بہت مدت نہین گذری کہ بتون کو اُسی خانۂ خدا مین بسایا جس کا معمار وہ پہلا بت شکن تھا ؟ جبکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ خالص توحید ہی دین فطرت ہے اور حالات مذاہب دیگر سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص توحید فہم انسان سے بالاتر ہے تو اس سوال کا جواب دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے، قرآن پاک نے جہان اس دعویٰ کا کھلم کھلا اعلان کیا ہے وہین اس کا جواب بھی دیدیا ہے، پس جس نے دعویٰ کیا ہے اوسی کا جواب بیان کرنا مناسب ہوگا ہم صرف اس کے سمجھنے کی کوشش کرینگے،

(۲۳) سورہ روم آیات (۲۸-۴۵) مین اس دعوی کو کہ دین فطرت توحید خالص ہی، بدلائل بیان کیا ہے، اون کی مفصل شرح تو اوسی سورت مین دیکھنی چاہیئے، مگر بطور خلاصہ یہان ذکر کیا جاتا ہے،

حکمت اور رحمت کی نشانیان جو انسان کو تمام عالم مین نظر آرہی ہین، اور اپنے رب کی طرف کشش جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے بتا رہی ہین کہ کس حاکم مطلق کی ہستی پر اوسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے، ایسی کوئی شہادت بتون یا مردون کے لیے نہین ملتی، مگر انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہین، وہ غلام بنائی گئے

اوراس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے، پس ان کو تو
جس ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور وہ ویسے ہی چل رہے ہین، مگر انسان کو چراغ عقل اور توشۂ
قابلیت دیکر میدان عالم مین چھوڑ دیا، پس اوسکی فطرت اوسکی قابلیت ہے، جس قدر
انسان نے آج تک ترقی کی ہے یہ سب اوسکی قابلیت ہی کے آثار ہین اور اسکی فطرت
ہی کے برگ وبار، یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہی کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہین،
بچۂ طاؤس جو ایک مضغۂ گوشت ہی جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پرون کی گلکاری
کو ہم اس کے فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہین، اسی طرح بچۂ انسان جو اکثر جانورون کی نسبت
زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بھی بڑھکر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر
پہنچتا ہے تو کیا اوسکی دانائی اور توانائی کو ہم اوسکی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھین، پس انسان
اور دیگر چیزون مین فطرت کے ایک ہی معنی ہین، البتہ انکی فطرت مین ایک بڑا نکتہ
بات ہے جو اور دوسرون مین نہین، یہ اول مین نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے مگر
آخر مین سب پر فائق ہو جاتا ہے، اوسکی طاقت کی تھاہ اب تک نہین ملی، مگر یہ سب دو
ناتوانیون کے درمیان ہے، اور اگر یون نہ ہوتا تو انسان سے دعواے فوقیت بھی ناموزون
نہ ہوتا، پس محض اس بات سے، کہ انسان کی فطرت ترقی کے بے انتہا مراحل طے کرتی
ہی، یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑجاے، پس آزادی راے اور پھر ناز

راہ اس کے حصہ مین آئی، ان دو مشکلون کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونون سے کبھی جدا ہو ہی نہین سکتی یعنی انسان نیکی اور بدی کی دوراہہ پر کھڑا کیا گیا جس کے بغیر اس کے حق مین آزادی نفظ بے معنی ہوتی، اور ترقی مراتب کے لیے عرصہ تنگ ہوتا پس کوشش اور کشش انسان کے فطرت کا لازمہ ہوا، اور نیکی و بدی کی کشمکش مین آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادہ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا،

انسان کو خدا تعالی نے ان دقتون مین ڈالکر اوسکی دستگیری کا وعدہ کیا ہی، اس کے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کر دیئے جس طرح بچہ ناتوان کے لیے، مان کا آغوش مہیا کیا، اسی طرح نوع انسان کے لیے پیغمبرون کو مبعوث فرمایا، جو خدا زمین مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے، وہی خدا اپنے کلام سے ویران دلون کو آباد کرتا ہی، جس طرح وہ بعضے بلند پہاڑون مین سے قدرتی چشمے نکال دیتا ہے، اسی طرح بعض اعلی دلون مین سے الٰہی کلمے جاری فرماتا ہے، پس اسقدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگردان ہو تو یہ نتیجہ فطرت نہین بلکہ اوسکی بے پروائی اور غفلت ہے، اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالین ملتی ہین تو اوس سے کہین زیادہ پرزور اس کے ابطال کی مثالین نظر آتی ہین، توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جمتا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے، جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرت انسانی کو توحید سے مناسبت

ہے ورنہ وہ کیون اس طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے

(   ) یہ مسئلہ کہ توحید داخل فطرت ہے اگرچہ ثابت ہوچکا تاہم یہ سوال باقی رہا کہ شرک کہان سے پیدا ہوتا ہے، اگر شرک جزو فطرت نہین تو کم سے کم یہ بیماری اس قدر کثیرالوقوع ہو اور اسی کے ساتھ مہلک بھی، کہ اس کے اسباب کا دریافت کرنا نہایت ضروری ہے، ورنہ اس سے محفوظ رہنا ممکن نہ ہوگا تفصیل کی نہ یہان ضرورت ہو اور نہ گنجایش بطور اصل الاصول کے یہ جاننا کافی ہے کہ شرک کے صرف دو سبب ہین، غفلت اور دنائت پہلا عقلی ہو اور دوسرا اخلاقی اور یہ دونون عدمی ہین، کیونکہ غفلت اسی کا نام ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی عقل سے جو بہترین تحفہ فطرت ہے کام نہ لے، عقائد مین اوہام باطلہ اور اعمال مین فوائد عاجلہ کی پیروی کرے، اور دنائت یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کے سر پر تاج خلافت رکھا گیا، وہ ایک مخلوق کی بندگی کرے اور باوجودیکہ اس کے لیے بزم قربت مین جگہ خالی رکھی گئی وہ اس دخمہ وحشت کی نیرنگیون پر فریفتہ ہوجائے،

شرح ولم یکن لہ کفواً احد،

نہ کوئی اوس کی برابری کا ہی

بیاض[1]

[1] مصنف نے مسودہ مین یہان سادہ صفحہ ہی شاید آئندہ کی تکمیل کے خیال سے جگہ خالی چھوڑ دی تھی مگر افسوس کہ وہ ہمیشہ کے لیے خالی رہ گئی ،

نتائج ہذا التعلیم فی ہذہ النشاۃ

جب وہی ذات پاک سب کا ملجا و مرکز ہے اور تمام عالم کا روے نیاز صرف اوسکی طرف ہے تو تمام بندگان خدا ایک ہی سطحِ عبودیت پر آگئے اور ہر ایک قسم کا فرق جس سے بنی آدم ایک دوسرے کے ارباب بن رہے تھے مٹا دیا گیا، غلام اور آقا ایک کر دیے گئے پیغمبر اور عامہ امت کے حقوق برابر ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فئی کو درمیان اپنے اور دیگر مسلمین کے بحصہ مساوی تقسیم کر دیا، انصار مین سے جب نقبا منتخب کئے تو اپنے تئین بھی ایک نقیب قرار دیا، البتہ فطری اور ضروری فرق مراتب کا قائم رکھنا واجب تھا، مثلاً پیغمبر کی طاعت سب پر فرض تھی، ایک قسم کی بزرگی جو ادب اور قیام معاشرت کی بنا ہے ملحوظ رکھی گئی جس طرح پر ماں باپ اور استاد کا ادب فرض ہے، باایمہمہ اسکو ایسی حد معتدل پر رکھا جس سے کم کرنا ممکن نہین، مثلاً منع کر دیا کہ میرے سامنے عجم کی طرح کھڑے نہ ہو، مجلس مین جہان جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ خادم سے کبھی کسی کام پر گرفت نہ کی، ایک شخص نے یکایک معلوم کر کے کہ آپ پیغمبر خدا ہین لگا آداب خدمت بجا لانے تو آپ نے فرمایا کہ مین تیرے مثل ایک آدمی ہون۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بادشاہی کرتے تھے مگر فقیری کے لباس

ہین، حضرت عمرؓ کا خبر رسان شتر سوار کے ساتھ ساتھ دوڑتا، اور جلیس کی گٹھری کندھے پر رکھکر ایک معمولی عورت کے گھر پہنچاتا، دیکھو اور پھر یہ کہ تین عظیم الشان سلطنتین جو ہر ایک بجائے خود شہنشاہی روے زمین کا دعوی کرچکی تھین، ان کے قدمون پر تاج و تخت نثار کررہی ہین، اسلام کو صبغۃ اللہ اس لیے کہا گیا کہ اس خم رنگرنگی کا اصطباغ تمام رنگون کو مٹا دیتا ہے، یہی روحانی اصطباغ ہے، اور یہی فطرتِ انسانی ہے، آدم علیہ السلام کی طینت جو غبار ہوکر پریشان تھی یہان آکر پھر ملجاتی، یہی خمیر گاہ نوع انسان ہے اور یہی سجدہ گاہ ملائک،

بر درِ میخانۂ عشق اے ملک تسبیح گو
کاندر انجا طینتِ آدم مخمر می کنند

اس میخانۂ عشق کا دوسرا نام اسلام ہے جہان جامِ توحید کا دور چلتا ہے اور اسکا جرعہ خوار کلاہِ کسری اور تاج قیصر کو کفِ پائے سے ملتا ہے،

بمعد میکدہ رندان قلندر باشند
کہ ستانند و دہند افسرِ شاہنشاہی

مگر اس بادۂ تند کے لیے ظرف چاہیے، جبلہ نے خلیفہ سے یہ حکم سنکر کہ اسلام نے معاشرت کی پست و بلند کو ہموار کردیا ہے اور یہان شاہ و گدا ایک ہی سطح پر کھڑے

ہوتے ہین، تاب نہ لاسکا اور پھر عیسائی بنگیا، اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم بھی پرتو وحدت تھی اور انھون نے مذاق عالم کو اوسکی چاشنی پہلے بخشدی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی اُمت کے لوگ اسلام کے لیے تیار تھے۔ انھون نے فرما دیا تھا کہ "اوس سلطنت الٰہی مین شیفتگانِ متاع دنیوی کا داخل ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے مین سے گذرنا" کیونکہ وہان سلطنت کے ساتھ گدائی کرنی ہو گی، اونٹ کو سوئی کے ناکے مین جانا ہو گا، پس اونکی تعلیم کی بنیاد ترک دولت تھی تاکہ نفس کُشی کے خوگر ہوجائین اور وقعت دولت دل سے محو ہوجائے، تاکہ جب دولت دیجائے تو اوسکو ہیچ سمجھین مگر بوسیدہ اور نکمی لکڑی سے کشتی نوح نہین بنسکتی، حضرت کا کمالِ نجاری مسلّم مگر افسوس کہ سامان نہتا اور کشتی تو کیا بنتی اس ناکارہ قوم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی،

اضاعونی وایّ فتیً اضاعوا

التوحید فی الحقوق

(   ) دین جب فطرت انسانی ہے اور انسان نے اپنی بیگانگی کو چھوڑکر نفس ناطقہ بنالیا اور اپنی فطرت اولی پر لایا گیا تو ضرور ہوا کہ اون کیلئے ایک ہی عام قانون ہو، شریعت موسوی مین دیکھو تو صاف معلوم ہو گا کہ لاوی قبیلہ کو خدمتگار دینی بنایا گیا اور بلا شبہہ برہمنون کی طرح اونکے حقوق مقرر کئے گیے اور جو طریق عبادت

کہ وہاں قائم کیا گیا اس کے لئے ایسی ہی لازم بھی تھا، مگر اسلام نے کوئی فرقہ پوجاریوں کا نہ بنایا ہر ایک شخص اپنا آپ کاہن بنا، ایک اللہ اکبر قربانی کے لیے کافی تھا اور مذبح پر خون چھڑکنا اور گوشت اور چربی اور گردوں کو جلانا اور اسی قسم کے احکام جو عقل کی گردن میں طوق اور زنجیر تھے اور عبادت الٰہی کے چہرہ پر نقاب ڈال رہے تھے موقوف کر دیئے، اور بجائے اس کے آسمان پر دھواں پہنچا کر دل کو تسلی دیں کہ خدا کو ہماری نذر پہنچی، یہ سچا طریق قربانی قرار دیا کہ بندگان خدا کو جن کے دل میں بھوک کی آگ جل رہی ہو آسودہ کرو اور ان کی شکر اور دعا کا بخور آسمان کی طرف بھیجو، یہاں ہر دل مذبح قربانی ہے، قربانی کرنے والا اور اس کا کھانیوالا دونوں ایک ہیں اس لیے اس کے کھانے میں دونوں برابر ہیں، یہ دعوت الٰہی کا فطری اور حقیقی طریقہ ہے، وہ ذات پاک "بے ہمہ" کھانے کا وہاں کیا کام، پھر وہ ذات پاک "باہمہ" بھی ہے، بندوں کو کھلایا تو اسکو قربانی پہنچی، اس دین فطرت کے تمام اعمال ایسے سیدھے اور صاف بنیاد پر رکھے گئے کہ اس میں بلندی و پستی اور پیچ و خم کی جگہ نہیں چھوڑی

اہمیت

مذکورۂ بالا بیان کے ضمن میں یہ بات تو معلوم ہو چکی کہ یہ سورہ حقیقی اور خالص اور کمال توحید کا سبق دیتی ہے، اور یہی دین اور مذہب کی جان ہے اور اس سورہ کی اہمیت اور عظمت کے لیے یہی کافی ہے، لیکن اسی کے اندر ایک عظیم الشان حقیقت بھی مضمر ہے

یعنی یہ ایک اکسیر ہے جس سے بدعات مذہبی کی مُہلک بیماریون کا استیصال ہوجاتا ہے، گویا اس سورۃ کی تعلیم نے مذہبی گمراہیون کو بیخ و بن سے اوکھاڑ دیا اس اجمال کو ذرا تفصیل کی ضرورت ہے[1]،

تمت

---

[1] مصنف مرحوم نے یہان حاشیہ مین آیندہ کی تفصیل کے لیے حسب ذیل یادداشت لکھی ہے،

(۱) بدعتِ بدہیت،

(۲) بدعتِ ہندویت،

(۳) بدعتِ یہودیت،

(۴) بدعتِ نصرانیت،

معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مذاہب مین خدا کی ذات و صفات کے مسئلہ مین جو بدعات تھین اون کو اس کی روشنی مین ظاہر فرماتے، اور رد کرتے، مگر افسوس کہ یہ حصہ بھی ناتمام رہا،

سلسلہ دائرہ حمیدیہ (۴)

تفسیر سورۂ کوثر

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبدالاحد اصلاحی

اصلاح پریس سرائے میر میں چھپی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (۱) ہم نے تجھے بخشا کوثر۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ (۲) پس اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھ اور اسی کیلئے قربانی کر

اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ (۳) تیرا دشمن خود ہی منقطع ہے۔

سورہ کا عمود اور ماقبل و مابعد سے ربط

۱۔ اگلی سورہ (سورۃ الماعون) کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بیان میں ہے جنھوں نے خانۂ کعبہ کے اہتمام میں خیانت کی۔ کیونکہ انھوں نے حج اور اس کے تمام مراسم بگاڑ دیئے اور توحید اور غربا پروری کی سنت مٹا کر نماز اور قربانی کی اصل حقیقت باطل کر دی، جس کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور اس بات کے سزاوار ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستور کے مطابق اس نعمت کو ان سے چھین لے اور ان کے سپرد کرے جو اس کے اہل ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (سورۂ محمد)

اگر تم برگشتہ ہو جاؤ گے تو خدا تمھاری جگہ دوسری قوم چن لے گا، پھر وہ لوگ تمھاری طرح نہ ہوں گے۔

اس سے پہلے جو جماعتیں خیانت و بدعہدی کی مرتکب ہوئیں، وہ ولایت بیت اللہ کے منصب سے محروم کردی گئیں۔ اسی دستور کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس سورہ (کوثر) کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی کہ بیت اللہ مسکن ابراہیم خلیلؑ۔ اور ان کی ذریت کی ولایت کے لئے خدا نے تم کو اور تمہاری امت کو منتخب کیا۔ اس ذریت کے ذریعہ خدا تمام قوموں کو برکت دے گا، جیسا کہ توراۃ میں وعدہ کیا ہے۔ اور اسی لئے بیت اللہ کو "مُبَارَکًا وَّ هُدًی لِّلنَّاسِ" سرچشمۂ برکت اور لوگوں کے لئے ہدایت، کہا۔

یہ عظیم الشان عطیۂ الٰہی یقیناً سب سے بڑی کامیابی اور خیر کثیر ہے۔ یہی عطیہ اس حوض کوثر کا ضامن ہے، جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔ ان اعتبارات سے یہ سورہ، سورہ ماعون کے بعد اسی طرح آئی ہے جس طرح عذاب کے بعد رحمت، سلب کے بعد بخشش، اور اہلِ دوزخ کے بعد اہل جنت کا ذکر آتا ہے۔ یہ اسلوب قرآنِ مجید میں عام ہے۔

نیز، چونکہ سورۂ مابعد میں جوار بیت اللہ سے ہجرت کا اعلان تھا، اسلئے نظم کلام مقتضی ہوا کہ پہلے بشارت اور تسلی کی سورہ ہو، تاکہ نظم قرآن ہی سے یہ واضح ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ نے رنج سے پہلے راحت کا فیصلہ کر لیا ہے، اگرچہ اس کا ظہور بعد میں ہو۔ اسی وجہ سے سورۂ کافرون، جس میں اعلان ہجرت ہے، دو مبشر سورتوں یعنی سورۂ کوثر اور سورۂ نصر کے درمیان رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی

بھی بشارت دی گئی تھی کہ آپ کی امت زیادہ ہوگی اور آپ کے اعدا بیت اللہ کی برکتوں سے محروم ہوں گے۔ اس لئے سورہ کافرون میں اس محرومی کی اصل علت، یعنی توحید کا بیان ہوا، جو بیت اللہ کا حقیقی سنگ بنیاد ہے۔

یہ سورہ کے عمود اور اس کے ربط پر ایک اجمالی نظر تھی۔ تشفی بخش تفصیلات آگے بعد میں آئینگی۔

لفظ کوثر کی تفسیر و تاویل

۲۔ اس سورہ کی صحیح تاویل لفظ "کوثر" میں چھپی ہوئی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے اس لفظ کی تحقیق کی جائے۔ اس کے متعلق سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں، اس لئے ٹھیک معنی کی تعیین کے لئے کسی قدر تفصیل ناگزیر ہے۔

(یہ معلوم ہے کہ "کوثر"، کثیر کا مبالغہ ہے۔ کثر کے معنی دولت و ثروت کے ہیں۔ پس کوثر کے معنی ہوں گے "بڑی کثرت اور برکت و ثروت والا" کثیر اور کثیر کی طرح کوثر بھی تسمیہ کے لئے مستعمل ہے۔ بطریق صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔ لبید کا شعر ہے ؎

وصاحب ملحوب فجعنا بموته ۔۔۔ وعند الرداع بیت آخر کوثر

اور ملحوب کا سوار جس کی موت کے غم نے ہم کو محزون کیا اور رداع کے پاس ایک دوسرا نامور سردار کی قبر ہے

امیہ بن ابی عائذ الہذلی کہتا ہے ؎

یحامی الحقیق لذلما احتدمن وجمعن فی کوثر کالجلال

وہ حرمت کی حفاظت کرتا ہے جب وہ گرم ہوتی ہیں، اور ہنہناتی ہیں بادبان کی طرح پھیلے ہوئے غبار میں

اس میں موصوف مقدر ہے یعنی "فی غبار کوثر"۔ اس سے فعل بھی مستعمل ہے۔ حسان بن

نشبتہ کا شعر ہے ۔

ابوا ان یبیحوا جارھم لعدوھم
وقد ثار نقع الموت حتی تکوثرا

انھوں نے اپنے پڑوسیوں کو دشمنوں کے لئے چھوڑ دینے سے انکار کر دیا، اور حال یہ تھا کہ موت کے غبار نے ابھر کر تمام چھپا لیا تھا

اس لیے ازروئے لغت یہاں کوثر کی تین تاویلیں ممکن ہیں۔

۱۔ یہ اسمیت کی طرف منقول ہو کر کسی خاص چیز کیلئے مخصوص ہو گیا ہو، جس کا نام اللہ تعالیٰ نے "کوثر" رکھا ہو۔

۲۔ اس کو ایسے موصوف مقدر کی صفت مانا جائے، جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو۔ مثلاً کہتے ہیں "مرد علی جرد" یعنی رجال مرد علی خیل جرد۔ (نوخیز نوجوان اصیل گھوڑوں پر) قرآن مجید میں ہے۔ "والذاریت" یعنی الریاح الذاریات (غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم) ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ یعنی فلک ذات الواح و دسر (تختوں اور کانٹوں والی کشتی) اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ لیکن ایسا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب صفت اس

موصوف کیلئے مخصوص ہو، کہ بمجرد ذکر صفت موصوف ذہن میں آجائے یا کوئی واضح قرینہ اسکی طرف اشارہ کردے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسماء صنف کی طرح اس کے عموم پر باقی رکھا جائے جو قلیل و کثیر پر یکساں دلالت کرتے ہیں اور کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت جوامع الکلم کی ہوگی۔ اور ہر اس چیز پر اس کی دلالت یکساں ہوگی، جس میں خیر کثیر ہو۔ البتہ قرائن کے اشارہ سے بعض افراد صنف پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہوگی۔

یہ تین احتمالات ہیں۔ لیکن ہم اس کی تاویل میں، جیسا کہ ساتویں فصل کے بعد معلوم ہوگا، جس اصل پر نظر رکھیں گے وہ نظم سورت، سیاق آیات، ربط معنی اور حسن تاویل کی رعایت ہے۔ رہا دوسرے وجوہ کا تذکرہ اور روایات کی تطبیق، تو اس سے ہم محض اسلئے تعرض کریں گے کہ جو لوگ محاسن نظم اور حسن تاویل کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے شبہات کا ازالہ ہوسکے۔ اس تمہید کے بعد ہم کوثر کی تاویل میں، سلف سے جو اقوال منقول ہیں، ان کو نقل کرتے ہیں۔

کوثر کی تاویل میں سلف کے اقوال

۳۔ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کئے ہیں۔

(۱۔ کوثر، جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، انسؓ، مجاہدؒ، اور ابوالعالیہ رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

۲۔ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؓ، عکرمہؓ، قتادہؓ اور مجاہد رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

۳۔ کوثر جنت میں ایک حوض ہے) یہ عطا رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

میرے نزدیک پہلے اور تیسرے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کو موقف کا حوض اور جنت کی نہر بھی کہا گیا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو۔ پھر حضرت عکرمہؓ سے، جو کہتے ہیں کہ کوثر سے خیر کثیر مراد ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ کوثر سے مراد نبوت ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کوثر قرآن ہے۔ اسی طرح حکمت اور اسلام کی روایتیں بھی ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام روایات کو نقل کر کے یہ روایت اختیار کی ہے کہ یہ جنت کی ایک نہر کا نام ہے) انھوں نے حضرت انسؓ کی روایت پر اعتماد کر لیا، اور

ان اقوال میں باہم تطبیق کی زحمت نہیں اٹھائی ہے، حالانکہ جو جماعت دوسری بات کہتی ہے، انہی میں سے بعض پہلی بات بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح پہلی بات کے کہنے والوں میں سے بعض دوسرے قول میں بھی شریک ہیں۔ پھر یہی لوگ ہیں جن سے قرآن، حکمت، اسلام اور نبوت کی روایتیں بھی ہیں۔ نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، اور آنحضرت صلعم نے اس کی کیفیت بیان کر دی تھی، پھر اس علم کے بعد، سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے اختلاف کیوں کیا؟ خصوصاً حبر الامۃ اور ترجمان القرآن اور ان کے شاگرد عکرمہ! اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اقوال پر غور کیا جائے، تاکہ اصل حقیقت، غیر مشتبہ صورت میں، سامنے آجائے۔

ان اقوال کا ماخذ اور اس امر کا بیان کہ ان سب کا مرجع ایک جامع حقیقت ہے

۱۴۔ جن لوگوں نے کوثر سے، جنت کی ایک نہر یا موقف کا حوض مراد لیا ہے انھوں نے اس کو اسم مانا ہے، جو وصفیت سے منقول ہو گیا ہے، اور اس روایت پر اعتماد کیا ہے، جس میں آنحضرت صلعم نے اس حوض کے متعلق خبر دی ہے، جو اللہ تعالیٰ آپ کو آخرت میں عطا فرمائے گا۔ اور جو لوگ اس سے "خیر کثیر" مراد لیتے ہیں وہ یا تو اس کا موصوف یعنی 'خیر' محذوف مانتے ہیں کہ موقع ذکر نعمت کا ہے، یا خود صفت ہی کو

خیر کثیر کے مفہوم میں لیتے ہیں اور دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے۔ ان کا اعتماد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے۔

۱۔ اگر لفظ کوثر صفت سے اسمیت کی طرف منقول ہوتا تو اس کو نکرہ آنا چاہیے تھا۔ مثلاً سلسبیل، تسنیم، علیین، سجین، غسلین۔ اور قرآن چونکہ عربی مبین میں ہے اس کی شرح کرنا، کیونکہ تسمیہ ایک وضع جدید ہے۔ اس لئے کوثر کو لام تعریف کے ساتھ استعمال کرنا، درانحالیکہ وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس سے لوگ واقف نہیں قرآن کے عربی مبین ہونے کے منافی ہے۔ اس لئے بطریق نص وہ کسی خاص چیز کا نام نہیں ہو سکتا البتہ بطریق تاویل اس سے کوئی ایسی چیز مراد لے سکتے ہیں جس میں خیر کثیر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ آخرت کی بخششوں کو یا تو بصیغہ مستقبل ذکر کرتا ہے یا ایسے قرائن کے ساتھ بیان کرتا ہے جن سے مستقبل مفہوم ہو سکے۔ مثلاً

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (الضحیٰ) اور جلد تیرا خدا اپنی بخشش سے تجھ کو خوش کر دیگا

.... يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (بنی اسرائیل) کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں کھڑا کرے۔

۳۔ لفظ اپنے عموم پر باقی رہنے کی صورت میں زیادہ وسعت و جامعیت رکھتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ قرآن دریائے معانی ہے۔ پھر لفظ کوثر خود وسعت کا مقتضی ہے، تحدید و اقتصار

اس کے مزاج کے خلاف ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جو لوگ اس سے خیر کثیر مراد لیتے ہیں، وہ اس نہر کا انکار نہیں کرتے جو آخرت کے کوثر کے متعلق وارد ہے۔ وہ لفظ کو اس کی وسعت و عمومیت پر باقی رکھتے ہیں، جس کے دائرہ میں آخرت کی بخششوں میں سے یہ جنت کی نہر بھی داخل ہے اور موجودہ نعمتوں میں سے قرآن، حکمت، نبوت، اور اسلام بھی۔ وہ ان سب پر اس کا اطلاق بطریق تسمیہ و تعیین نہیں بلکہ بطریق تفصیل کرتے ہیں یعنی لفظ کو اس کے عموم پر باقی رکھ کر اس کے مختلف معانی میں سے، اس فرد پر اس کا اطلاق کر دیا جو سب سے زیادہ جامع اور اکمل ہے۔

ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے تھے۔ اس لئے کوثر سے قرآن بھی مراد لیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے۔ اسی طرح حکمت بھی مراد لی کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ جس کو حکمت بخشی گئی اس کو خیر کثیر بخشا گیا۔ اور یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ قرآن تمام جواہر حکمت کا خزانہ ہے۔ اسی اصول کے مطابق نبوت بھی اس کے دائرہ میں آگئی کہ فرمایا گیا ہے:۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر۔ اسی طرح اسلام بھی اسمیں

داخل ہے۔ بلکہ اسلام کی وسعت و ہمہ گیری کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہے کہ تمام کائنات اس میں سما گئی ہے۔

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — آسمانوں اور زمین میں جو ہیں، سب اس کے سامنے سرفگندہ ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ یہ تمام اقوال قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور اگرچہ الفاظ مختلف ہو گئے ہیں، لیکن حقیقت ایک ہی ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذیل میں اولاد کی کثرت، علماء و اتباع کی زیادتی، فضائل اخلاق، حسن شہرت، خلق حسن، مقام محمود، خود اس سورہ اور تمام انعامات خداوندی کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور اس کو ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں مذکورہ عمومیت میں داخل ہیں، لیکن بعض لفظ کوثر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں، تاہم لفظ کا عموم ان سب پر حاوی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک، استنباط کے لحاظ سے، سلف کی تفسیر زیادہ صاف اور جچی تلی ہے۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس میں بہت سے مذہب نہیں ہیں، جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ صرف دو مذہب ہیں۔ ایک یہ کہ کوثر سے کوئی خاص چیز مراد لی جائے۔ یعنی حوض موقف یا نہر جنت، یا حکمت یا قرآن یا اسی قسم

کی کوئی اور چیز۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ عام ہے، ہر چیز جس میں خیر کثیر ہو اس کے دائرہ میں داخل ہے۔ جو لوگ اس کو کسی معین چیز کا نام قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلعم نے نہر جنت کا ذکر کوثر کے نام سے فرمایا ہے۔ اور جو لوگ اس کو نہر اور نہر کے علاوہ دوسری چیزوں کے لئے عام مانتے ہیں، وہ حدیث اور قرآن میں تطبیق دینا چاہتے ہیں انھوں نے قرآن کی تاویل، اس کی عبارت کے اقتضاء کے مطابق کی۔ اور حدیث کی تاویل، اس طرح کر دی کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں پڑتی۔ اس لئے یہ اختلاف نہ ہوا بلکہ دو تاویلوں میں جمع کی شکل ہوئی، کیونکہ عام اور خاص میں کوئی تباین نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس کے دو مختلف قولوں میں اسی قسم کی تطبیق حضرت سعید بن جبیر رض نے دی ہے۔ چنانچہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت یہ کی ہے۔

حدثنا ابو کریب قال حدثنا	...... سعید بن جبیر
عمر بن عبید عن عطاء عن	ابن عباس رض سے روایت کرتے ہیں کہ
سعید بن جبیر عن ابن عباس	انھوں نے فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے
قال الکوثر نهر فی الجنة	اس کے کنارے سونے اور چاندی کے ہیں
حافتاه من ذهب وفضة	اور وہ در و یاقوت پر بہتی ہے،

یجری علی الیاقوت تربته	اس کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا
اشد بیاضاً ماءہ ابیض من الثلج	اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔
واحلی من العسل	. . . .

دوسری روایت یہ ہے اور اسی قسم کی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے

قال حدثنی یعقوب قال	کہا مجھ سے حدیث بیان کی یعقوب نے،
حدثنی هشیم قال اخبرنا	کہا مجھ سے حدیث بیان کی ہشیم نے،
ابو بشر و عطاء بن السائب	کہا ہم کو خبر دی ابو بشر اور عباس
عن سعید بن جبیر عن ابن	ابن سائب نے ان دونوں نے روایت
عباس انہ قال الکوثر هو الخیر	کی ابن عباس سے کہ انھوں نے کہا
الکثیر الذی اعطاہ اللہ	کہ کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے
ایاہ قال ابو بشر فقلت	آنحضرت کو بخشا۔ ابو بشر کہتے ہیں کہ
لسعید بن جبیر فان ناسا	میں نے سعید بن جبیر سے کہا کہ کچھ لوگوں
یزعمون انہ نهر فی الجنۃ	کا خیال ہے کہ جنت کی ایک نہر ہے،
قال فقال سعید النهر	تو سعید نے جواب دیا کہ یہ جنت کی نہر
الذی فی الجنۃ من الخیر	اسی خیر کثیر میں ہے جو اللہ تعالیٰ

الذی اعطاہ اللہ ایاہ   نے آپ کو بخشا ہے۔

یہ دو قولوں کے درمیان تطبیق کی شکل ہے۔ یعنی خاص اور عام میں توفیق پیدا کردی گئی ہے۔ پھر، اگر قرآن اور حدیث کے درمیان کامل تطبیق کے لئے یہ کہا جائے کہ جو کوثر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلعم کو دنیا میں عطا فرمایا ہے، وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف کا حوض اور جنت کی نہر ہے تو یہ تطبیق زیادہ بہتر ہوگی، اور بہ اعتبار تاویل بھی زیادہ مناسب اور خوبصورت ہے۔ ہم آئندہ فصلوں میں اسی اجمال کی شرح کریں گے۔

چند اشارات کہ کوثر، خانہ کعبہ اور اس کا ماحول ہے

پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارہ میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کے عموم اور صیغہ ماضی کی رعایت سے ان چیزوں کو بھی اس کے دائرہ میں داخل کردیا ہے جو داخل ہو سکتی ہیں۔ تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمّٰی (کوثر) ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں مزید جستجو اور کاوش جائز سمجھی۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے۔ اس لئے اگر میں کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں جو دونوں کوثروں کو ایک کردے، تو جس طرح میں سلف کو اس بات میں

ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا، اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا۔

البتہ یہ فرق ہوگا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دیکر، اس سے حوض یا نہر جنت سمجھی، اور ان کے سوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو۔ مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت جنکو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں۔ مگر میں اس سے وہ چیز مراد لیتا ہوں جس کو اس حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے۔ جس کی کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں، اور جس کی حقیقت و روحانیت، شب معراج میں، آپکے سامنے بے نقاب ہوئی۔ کیونکہ یہ ثابت ہو کہ اس میموں رات میں، جب پروردگار عالم نے اس عالم آب گل کی بہت سی چیزوں کے حقائق آپ کے لئے بے حجاب کئے تو اس کوثر کی روحانیت کا بھی آپ کو مشاہدہ کرایا جو اس دنیا میں آپ کو بخشا گیا۔

اس عالم کے جو اسرار آپ پر بے نقاب ہوئے تھے، آپ کبھی ان کا ذکر تصریحاً فرماتے تھے مثلاً سورہ بقرہ اور آل عمران کے متعلق فرمایا: "وہ دونوں بدلیوں کی شکل میں نمودار ہوں گی"، دنیا کی بابت فرمایا "وہ بڑھیا کی شکل میں آئے گی" موت کی نسبت فرمایا "وہ ایک مینڈھے کی صورت میں آئے گی"، اور کبھی صرف اشارہ فرما دیتے تھے کہ لوگ اس پر تدبر کریں، اور ان کے ذہن و عقل کی تربیت ہو۔ اسلئے یہ نہیں خیال کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلعم نے تصریحاً یہ نہیں فرمایا کہ خانہ کعبہ، قیامت

۔یک دن حوض کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا، کیونکہ آپ نے اس کی طرف اشارات فرمائے ہیں اور ہم کو ان پر غور و فکر کی ترغیب دی ہے۔

اس تمہید کے بعد، ہم ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جو ہمارے دعویٰ پر حجت ہیں۔

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نفوس کے اندر، خدا کی طرف ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے۔ نفس انسانی اس سے محروم رہ کر تسلی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا سرچشمہ ہے۔ اسی اشتیاق و بے قراری کا نتیجہ ہے کہ تم دنیا کی کوئی قوم مذہب سے خالی نہیں پاتے۔

اب سوچو! اس فطری اشتیاق اور چاہ کی سب سے زیادہ موزوں تعبیر "پیاس" کے سوا کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تمثیل اکثر استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر ان موحدین کے حال پر غور کرو، جو حج کے ایام میں، بیت اللہ کے پاس، سراپا شوق و آرزو ہو کر جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال، ان خشک لب پیاسوں کی سی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہو گئے ہوں؟ اگر یہ تشابہ واضح ہے تو خانہ کعبہ ان کے لئے دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے، جس پر میدانِ حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲- آنحضرت صلعم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا:-

ارأیتم لو ان نهرا بباب	بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ
احدکم یغتسل فیه کل یوم	پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ
خمسًا الحدیث	پانچ مرتبہ نہاتا ہو ....

یہ تمثیل ایک دوسرے پہلو سے پانی ہی کی ہے۔ جس طرح پانی سیرابی کا ذریعہ ہے، اسی طرح طہارت کا ذریعہ ہے۔ اور معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے، اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اسی سرچشمہ کی نہریں ہیں، جن سے ہم سیرابی اور پاکیزگی حاصل کرتے ہیں۔

۳- خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں، اس امت کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح حوض کوثر پر اس کا اجتماع اسکی کثرت کے اظہار کا سبب ہوگا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ دوسری امتیں اس اجتماع سے اندازہ کرتی ہیں، کہ زائرین بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحر بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے، جو پوری سطح ارض کو محیط ہے۔ پس جس طرح حوض کوثر پر، اس کے اجتماع سے، دوسرے انبیاء کی امتوں پر اسکی کثرت واضح ہوگی، اسی طرح موسم حج میں، خانہ کعبہ کے پاس اسکا اجتماع اظہار

کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو! لفظ کوثر ان دونوں کی مطابقت کو کس طرح واضح کرتا ہے۔

۴۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی امت کو حوض کوثر پر وضو کے آثار سے پہچانینگے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوص قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کرینگے، وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۵۔ فتح مکہ کو خدا نے امت کی کثرت کا سبب بنایا۔ چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶۔ مسجد حرام کو خدا نے "مبارک" (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران ۹۶)	بے شبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کے لئے تعمیر ہوا، وہ ہے جو مکہ میں ہے، سرچشمۂ خیر و برکت اور لوگوں کے لئے ہدایت۔

اس گھر کو خدا نے ایسی برکت سے نوازا کہ تمام عالم اس کی برکتوں سے مالامال ہوا۔ اور جیسا کہ ابراہیم خلیلؑ سے وعدہ کیا گیا تھا، حضرت اسمٰعیل کی ذریت میں خدا کی برکت حضرت اسحٰق کی ذریت سے زیادہ ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل سورۂ فیل میں گذر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام برکتیں اسی بیت اللہ اور نماز و قربانی کا ثمرہ ہیں۔

یہاں شبہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے قرآن کو بھی مبارک کہا ہے۔ اس لئے حوض کوثر کے ساتھ اس کی مشابہت بھی واضح ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن کو مبارک دوسرے پہلو سے کہا گیا ہے۔ جس طرح بارش کو خدا نے مبارک کہا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی مبارک کہا، بارش آسمان سے برس کر مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے، اور قرآن نے آسمان سے نازل ہو کر مردہ دلوں کو زندہ کر دیا۔ قرآن کو مبارک کہنے میں حوض سے مشابہت کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن کی عظمت اور بے پایاں وسعت کے اعتبار سے یہ تشبیہ بلاغت کے خلاف ہوگی۔

۷۔ یہ سورہ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبہ اسلام اور کثرت امت کا فتح باب ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اس صلح کو "فتح مبین" سے تعبیر کیا۔ سورہ کے زمانہ نزول پر، چودھویں فصل میں مفصل گفتگو ہوگی۔

۸۔ آنحضرت صلعم نے اس حوض کے ایک گوشہ کے متعلق خبر دیکر باقی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں مروی ہے۔

قال علیہ السلام ما بین	آنحضرت صلعم نے فرمایا میرے گھر اور میرے
بیتی ومنبری روضۃ	منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں
من ریاض الجنۃ ومنبری	سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے

علی حوضی	حوض کے اوپر ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مبارک سرزمین، جس میں حجاج یکجا ہوتے ہیں اس حوض کوثر کی شکل اختیار کرے گی، جس کی آنحضرت صلعم نے خبر دی ہے، میرے نزدیک بخاری کی مندرجہ ذیل روایت (مذکورہ نمبر ۹) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نکلے، ایک شخص کے جنازہ کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لائے (یعنی منبر مسجد پر) اور فرمایا۔

انی فرط لکم وانا شہید	میں تمھارے لئے حوض پر آگے جانے
علیکم وانی واللہ لانظر	والا ہوں، اور تمھارے لئے شہادت
الی حوضی الآن وانی	دونگا، اور قسم خدا کی میں اسوقت
اعطیت مفاتیح خزائن	اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھ
الارض او مفاتیح الارض	زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں
وانی واللہ ما اخاف علیکم	یا راوی کو شبہ ہو کہ آپ نے یہ فرمایا کہ زمین کی
ان تشرکوا بعدی ولکن	کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور مجھے، خدا کی قسم
اخاف علیکم ان تنافسوا فیہا	تم سے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم میرے

"فرط" عربی میں، اس شخص کو کہتے ہیں جو حوض پر پہلے سے پہنچکر قافلہ کے لئے ڈول اور رسی وغیرہ کا انتظام کر کے حوض کو بھر رکھتا ہے۔ "شہید علیکم" سے یہ مطلب ہے کہ آپ اپنی امت کو پہچانیں گے، اور لوگوں کے متعلق اپنی امت میں سے ہونے کی گواہی دیں گے۔ یہ آپ کی طرف سے شفاعت ہو گی۔

ان لفظوں میں، آپ نے ان حالات کو بیان فرمایا ہے جو آخرت میں پیش آئینگے۔ پھر آپ نے اشارہ فرما دیا کہ اس حوض کوثر کی ظاہری مثال آپ کے سامنے ہے، کیونکہ، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، آپ کا منبر آپ کے حوض کے اوپر ہے۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا:- مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، تو اس سے فتح مکہ کے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا، چنانچہ فتح مکہ تمام زمین اور اس کے خزانوں کی فتح کا دیباچہ ثابت ہوئی۔

۱۰۔ آنحضرت صلعم نے ظاہر فرمایا ہے کہ آپکے حوض کا طول مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت جتنا ہے۔ اس لطیف اشارہ سے ارض حرم اور آپکے حوض کی مطابقت بھی واضح ہو گئی۔

لیکن اس جگہ ایک شخص کے دل میں خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ کی مراد یہی تھی تو اس کو کھول کر کیوں نہیں فرما دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام

کی تعبیر کے لئے قرآن مجید نے جو لفظ انتخاب کیا ہے، وہ بے شمار حقائق و معارف کا گنجینہ اور ہمارے لئے دعوت تفکر ہے۔ یہ ایک لفظ امت کی کثرت، مکہ کی فتح، ایام حج میں خانہ کعبہ کے پاس، اور محشر میں حوض کوثر پر، امت کے اژدحام، ان تمام حقایق کی طرف ایک ساتھ انگلی اٹھا کر اشارہ کرتا ہے۔

یہ تمام اشارات ہم نے اس مقصد کی تمہید و تائید کے لئے یکجا کئے ہیں جو نظم کلام سے واضح ہوتا ہے اور جس کی تفصیل انشاءاللہ اگلی فصلوں میں آئے گی۔ اب تھوڑی دیر توقف کر کے حوض کوثر کی شکل و ہیئت پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمارے مذکورہ نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ کوثر آخرت درحقیقت خانہ کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی تصویر ہے۔ بعد کی فصل میں اس اجمال کی تفصیل ہے۔

نہر کوثر خانۂ کعبہ اور اسکے ماحول کی روحانیت کی تصویر ہے

(۷) معراج میں جو نہر کوثر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی تھی، اس کی صفات پر جو شخص غور کرے گا، اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی مثال ہے۔ اس کے متعلق مختلف طرق سے جو روایات

مروی ہیں، ان کی مشترک حقیقت یہ ہے کہ کوثر ایک نہر ہے، اس کے کناروں پر مجوف موتیوں کے قبے ہیں۔ اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اس میں ظروف ہیں جو آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں، برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس پر چڑیاں اترتی ہیں، جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں۔ ایک شخص نے کہا تب تو وہ بہت ہی خوش قسمت ہوں گی! آپ نے فرمایا: ان کے کھانے والے ان سے زیادہ خوش قسمت ہوں گے! اس کے پانی کی آواز ایسی محسوس ہوگی جیسے تم اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے ہو۔)

یہ تفصیلات ہم نے تمام روایات جمع کرکے یکجا کی ہیں۔ بخاری میں یہ الفاظ ہیں۔

بینا انا اسیر فی الجنۃ اذا انا	میں جنت میں گشت کر رہا تھا کہ ناگہاں
بنھر حافتاہ قباب الدر	ایک نہر پر گزر ہوا، اس کے دونوں
المجوف فقلت ما ھذا یا	کناروں پر مجوف موتیوں کے قبے تھے
جبریل قال ھٰذا الکوثر	میں نے جبریل سے پوچھا یہ کیا ہے؟
الذی اعطاک ربک قال	انھوں نے جواب دیا یہ وہ کوثر ہے
فضرب الملک بیدہٖ فاذا	جو آپ کو آپ کے رب نے بخشا ہے۔ فرمایا

طینہ مسك اذ فر: پھر فرشتہ نے زمین پر ہاتھ مارا تو اسکی مٹی نہایت خوشبودار مشک تھی۔

اب ایک لمحہ توقف کرکے کعبہ اور اس کے ماحول کے مشاہدات پر غور کرو جب تمام اکناف عالم سے، موحدین کے قافلے عشق و محبت الٰہی کی پیاس بجھانے کے لئے اس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکھٹے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے احساس روحانی میں، اس مقدس وادی کے سنگریزے، یاقوت و زمرد سے زیادہ پرجمال، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کے ارد گرد حجاج کے خیمے، مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ حسین و خوبصورت نہیں ہیں؟ ایک قدم آگے بڑھ کر پھر غور کرو! حجاج اور ان کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں میں تم کو کس حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے؟ کیا یہ ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے؟ پھر ان کی خوش بختی اور فیروزمندی پر غور کرو۔ یہ اشرف المخلوقات انسان کی قائم مقام بن کر خدا کے سامنے قربان ہوں گی۔ گویا وہ بمنزلہ انسان ہیں۔ ان سے بڑھ کر خوش بخت اور فیروزمند کون ہوسکتا ہے! پھر ان کے خوش قسمت کھانے والوں کو دیکھو، یہ کون ہیں؟ اللہ کے مہمان؟ کیا اللہ کے مہمانوں سے بھی بڑھ کر کسی کا طالع اچھا ہے؟ ایک نگاہ تعمق اس تشبیہ کے محاسن پر بھی ڈالو، حوض پر اترنے والی چڑیوں کو، قربانی کے اونٹوں سے تشبیہ دیکر اور ان کے کھانے والوں کا ذکر کرکے۔

اشارہ کر دیا کہ جڑیوں سے مقصود یہی قربانی کے اونٹ ہیں۔ پھر اشارہ کتنا لطیف ہے! جڑیوں کی گردن کو قربانی کے اونٹوں کی گردن سے تشبیہ دی کہ اس جز سے پورے کل پر روشنی پڑ جائے۔ نیز دیکھو! "بدن" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، بلکہ "جزور" کا لفظ استعمال کیا جس کی عمومیت میں ابہام ہے۔ تم پوچھ سکتے ہو کہ اتنی رازداری، اور اس قدر اشارات و کنایات کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تاکہ عقل سلیم اس سے حقائق کا استنباط کرے۔ اللہ تعالیٰ جب قرآن میں دلائل حکمت کی تفصیل کرتا ہے تو آخر میں عموماً یہ آیت آتی ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ اس میں غور کرنے والوں کے لئے بہت سی دلیلیں ہیں۔ کہیں کہیں "یعلمون" اور "یتفکرون" کے الفاظ بھی آتے ہیں، جس طرح قرآن مجید سراپا دعوت فکر و نظر ہے، اسی طرح اس کا حامل بھی بہترین معلم تھا، وہ عقل انسانی کی تربیت کرتا تھا، اور اس کو اکتساب حکمت کے لائق بناتا تھا۔ اس تربیت عقل کے لئے آپ بسا اوقات صحابہ رضی سے بعض امور کی مخفی مناسبتوں کے متعلق سوالات کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ آپ نے پوچھا درختوں میں مومن سے اشبہ کون درخت ہے؟ عیسیٰ علیہ السلام امثال میں گفتگو فرماتے تھے۔ لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کھول کر بات کیوں نہیں کہتے؟ انھوں نے جواب دیا "تاکہ عقلاء ہی سمجھیں"، بعینہ یہی حقیقت قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۔۔۔ یہ مثلیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے

وَمَا یَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ہیں لیکن اس کو وہی سمجھیں گے جو اہل علم ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ اشارات کو تعلیم و تربیت میں مخصوص اہمیت حاصل ہے۔

یروشلم کی روحانیت

ہم نے گذشتہ فصل میں خانہ کعبہ کی روحانیت کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے،
مکاشفات یوحنا باب ۲۱ میں اسی کے مشابہ یروشلم کی روحانیت بیان کی گئی ہے۔

اور وہ مجھے روح میں ایک بڑے اور اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور شہر مقدس یروشلم کو خدا کے پاس سے اترتے دکھایا۔ اس میں خدا کا جلال تھا۔ اور اس کی چمک نہایت قیمتی پتھر یعنی اس یشب کی سی تھی جو بلور کی طرح شفاف ہو (اسکے بعد اس کی شہرپناہ، مسافت، دروازوں اور اس کے رہنے والوں یعنی خاندان اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تفصیل کے بعد کہا) اور اس کی شہرپناہ کی تعمیر یشب کی تھی، اور شہر ایسے خالص سونے کا تھا جو شفاف شیشے کے مانند ہو، اور اس شہر کی شہرپناہ کی بنیادیں ہر طرح کے جواہر سے آراستہ تھیں، پہلی بنیاد یشب کی تھی، دوسری نیلم کی، تیسری شب چراغ کی، چوتھی زمرد کی، پانچویں عقیق کی، چھٹی لعل کی، ساتویں سنہرے پتھر کی، آٹھویں فیروزے کی، نویں زبرجد کی، دسویں یاقوت کی، گیارھویں سنگ سنبلی کی، اور بارھویں

یاقوت کی، اور بارہ دروازے بارہ موتیوں کے تھے، ہر دروازہ ایک ایک موتی کا تھا۔ اور شہر کی سڑک شفاف شیشے کے مانند خالص سونے کی تھی۔" اس کے بعد کہا ہے کہ "اس میں کوئی مقدس نہیں ہے اور اس میں صرف ایک خدا کی عبادت ہو گی۔"

ممکن ہے کہ نقل روایت میں کچھ کمی بیشی کر دی گئی ہو۔ ہمارا مقصد اس سے صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں جو اعیان و اعراض ہیں، ان کی روحانی مثال کا خیال ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے۔ یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں صرف ان صفات کا تذکرہ کیا ہے جو قوت باصرہ کی گرفت میں آتی ہیں۔ لیکن کعبہ کی جو روحانیت بیان ہوئی ہے اس میں ہر حاسہ کیلئے حلاوت ہے۔ یہاں تک کہ پانی کی روانی کی آواز کا بھی ذکر ہے، اور ایک پیاسے کے لئے، دور سے پانی کی روانی کے نغمہ سے زیادہ شیریں اور جاں فزا نغمہ کیا ہو سکتا ہے! پھر جو دیدار الٰہی کی پیاس سے تڑپ رہے ہیں، ان کے لئے شیریں اور ٹھنڈے پانی کی سیرابی اگر نہیں ہے تو کیا ہے؟ حضرت مسیح نے ایسوں ہی کے بارہ میں فرمایا ہے۔

"مبارک ہیں وہ، جو بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وہی آسودہ ہوں گے۔"

انا اعطیناک الکوثر کی تفسیر

لفظ کوثر کا ٹھیک مطلب معلوم ہو جانے کے بعد پہلی آیت کی تفسیر صاف ہو گئی

یعنی پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے برکت اور کثرت امت کی جو گرانمایہ دولت مقدر تھی، اس آیت میں اسی کا پیام بشارت ہے۔ جب اس وعدہ کی تکمیل کا وقت قریب آگیا، اسکی خبر دے دی گئی کہ آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے لئے اسلام کے غلبہ اور مکہ کی فتح کی خوشخبری ہو۔ یعنی سادہ لفظوں میں گویا یوں کہا گیا: اللہ تعالی نے تم کو نماز پڑھنے والی اور راہ خدا میں خرچ کرنے والی ایک عظیم الشان امت دی ہے جو بیت اللہ الحرام کا حج کرے گی۔ چنانچہ سورۂ حج میں ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ	یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ
الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ	کے پاس آباد کیا اور یہ ہدایت کی کہ میرا
شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ	کسی کو ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف
وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ	کرنے والوں اور میری عبادت میں
وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ	کھڑے ہونے والوں اور رکوع و سجدہ
يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ	کرنے والوں (یعنی نماز پڑھنے والوں) کیلئے
ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ	پاک رکھنا، اور لوگوں میں حج کا اعلان
عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ	کر دو، وہ تمھارے پاس پیادہ اور لاغر
	اونٹوں پر گہرے راستوں سے آئیں۔

(یعنی خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے قریب پیادہ
آئیں اور دور دراز گوشوں سے سدھائے
ہوئے لاغر اونٹوں پر۔ اور مکہ میں ہر راہ سے
داخل ہوں، یہاں تک کہ آمد و شد کی کثرت
سے راستے گہرے ہو جائیں) تاکہ اپنے منافع کی
جگہ پر آئیں (یعنی یہ شہر ان کا مرکز بنے گا، وہ
اسکی تجارت سے منفعت حاصل کریں گے اور یہ ہیں
ان کا باہمی اختلاط، ان کے اجتماعی رشتوں
اور رحمی تعلقات کے استحکام کا ذریعہ ہوگا
چنانچہ عرفات کے اجتماع میں خطیب ان کو
صلح اور صلۂ رحم کی دعوت دیتا تھا۔ اور اسی
وجہ سے عرب مکہ کو صلاح، اور ام الرحم بھی
کہتے تھے۔ اس سے زیادہ معاشی اور اجتماعی
فوائد اور کیا ہو سکتے ہیں؟)......

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيٓ اَيَّامٍ   اور چند متعین دنوں میں، ان چوپایوں

مَعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ	پر جو اللہ نے ان کو روزی کئے ہیں اللہ
مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا	کا نام لیں (یہ دینی منفعت ہے۔ عربوں نے
وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ؕ	باوجود شرک کے خدا کو نہیں چھوڑا تھا
(حج - ۲۶-۲۷-۲۸)	البتہ اس کے دربار کے لئے شفعا ٹھیرا لئے
	تھے) پس اس میں سے کھاؤ اور تنگ حال
	فقیر کو کھلاؤ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ ایک عظیم الشان امت کے لئے، توحید، نماز، اور اطعام فقرا کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور وہ امت دنیا کے تمام گوشوں سے اس کے حج کے لئے مجتمع ہوگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اس عظیم الشان امت کے لئے ایک نبی مبعوث فرمائے۔ یہ دعا مستجاب ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا نے ان کی ذریت کی کثرت کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور توریت میں ہے کہ کثرت ذریت کا وعدہ حضرت اسمٰعیل کی نسل میں خاص طور پر پورا ہوگا۔ اہل کتاب کو اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ اور اوائل بعثت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو اس بخشش کی خوشخبری دیدی تھی چنانچہ سورۃ الضحیٰ میں ہے:۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ	جلد تیرا خدا اپنی بخشش سے تجھے خوش

فَتَرْضیٰ۔ کردے گا۔

یہی وعدہ جس کے قرب کا ذکر فرمایا تھا "انا اعطینا" کہکر پورا کردیا۔ اب لفظ کوثر کو سامنے رکھ کر "فترضیٰ" کی تفسیر پر غور کرو! رحمت عالم کو غایت رحمت کی وجہ سے، لوگوں کی ہدایت واصلاح کی جو بے پایاں آرزو تھی، وہ ایک محدود امت کے ایمان واسلام سے نہیں پوری ہو سکتی تھی، اور نہ اس طرح پوری ہو سکتی تھی کہ دنیا میں تو آپ کے متبعین کی کثرت ہو، لیکن آخرت میں یہ نعمت چھن جائے۔ اور حوض کوثر پر ان کی تعداد تھوڑی رہ جائے "فترضیٰ" اور "الکوثر" کے الفاظ نے ان تمام شبہات کا ازالہ کردیا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ احادیث صحیحہ میں کثرت امت کا ذکر آیا ہے۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں پہلی آیت پر غور کرو! اس میں متعدد بشارتیں پنہاں ہیں

۱۔ مکہ عنقریب فتح ہوگا

۲۔ لوگوں کی کثیر تعداد، آپ کی امت میں داخل ہوگی۔

۳۔ ان لوگوں کے زعم کے خلاف، جو کہتے ہیں کہ اس امت کا بڑا حصہ مرتد ہوجائے گا، ایک بڑا طبقہ دین حق پر قائم رہے گا۔

ان کے علاوہ اور متعدد بشارتیں اس سورۃ میں پنہاں ہیں، جنکی تفصیل

بعد میں آئے گی، یہ پوری سورۃ بشارتوں کا مجموعہ ہے۔ وللہ الحمد

فصل لربک وانحر کی تفسیر اور ماقبل سے تعلق

۵۔ اس آیت سے چار اہم حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔

۱۔ نماز اور قربانی کو اس عطیہ سے کوئی خاص تعلق ہے، کیونکہ صیغہ امر پر ف داخل ہے۔

۲۔ ان دونوں کو، عام طور پر الگ الگ کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور مخصوص ایام حج میں ایک ساتھ کرنے کا بھی۔

۳۔ نماز اور قربانی میں باہم گر کوئی خاص تعلق ہے۔

۴۔ یہ عطیہ ہمارے لئے مخصوص ہے۔ نیز یہ کہ نماز اور قربانی دونوں ضروری ہیں۔
اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر صرف ہم ہیں۔ مشرکین اور مبتدعین یہود و نصاریٰ اس شرف سے محروم ہیں۔ مشرکین اس لئے کہ ان کی نماز اور قربانی اللہ واحد کے لئے نہیں تھی۔ یہود، اس لئے کہ انھوں نے صرف قربانی لے لی۔ نماز غائب کردی۔ نیز ان کی قربانی "نحر" نہ تھی، نحر کا لفظ اونٹ کی قربانی کیلئے مخصوص ہے اور اونٹ ان کے ہاں حرام تھا۔ نصاریٰ، اس لئے کہ ان کے ہاں قربانی سرے سے نہیں ہے، اور نماز ان کے خیال میں واجب نہیں ہے۔ یہ مجمل اشارات ہیں، ان کی

تفصیل کی ضرورت ہے۔ ہم متعدد فصلوں میں ان اشارات کی شرح کریں گے۔ یہیں دو باتیں تو اس فصل میں بیان کر دیتے ہیں۔ باقی دو باتوں کی تفصیل آئندہ فصلوں میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو اس عطیہ کی بشارت دینے کے بعد، دو باتوں کا حکم دیا: (نماز اور قربانی) اور امر کے صیغہ پر تعقیب کی ف داخل کی۔ تو اعد زبان کے اعتبار سے تعقیب کی ف سابق و لاحق یعنی عطیہ اور حکم کے درمیان نسبت اور تعلق کی دلیل ہے۔ اس لئے ہم نے نظم کلام پر غور کیا، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ربط کے بعض پہلو معلوم ہوئے ذیل میں ترتیب ان کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اس حکم میں، اس بخشش کا اصلی مقصود پنہاں ہے، کیونکہ بخشش بہت بڑے مقصد کیلئے تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ	جو اگر ہم ان کو زمین میں تمکن دیں
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ	تو نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، معروف
وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَھَوۡا	کا حکم دیں گے، منکر سے روکیں گے۔
عَنِ الۡمُنۡکَرِ (حج ۴۱)	

ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرمایا گیا ہے

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ

اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس، بسایا ہے اے ہمارے پروردگار! اس لئے کہ یہ نماز قائم کریں، پس تو یوں کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں۔ (یعنی لوگ ان کے پاس تیرے گھر کی زیارت کے لئے آئیں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے قدیم وطن سے ہجرت کرکے ایک بے آب وگیاہ سرزمین میں بسنا، محض اس لئے تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کا ایک مرکز تعمیر ہو، جو لوگوں کی عقیدت وانابت، سعی وطواف اور نذر ونیاز کا قبلہ ہو۔ اور جس طرح غلام اپنے آقا کی ڈیوڑھی پر گوش برآواز سرگرم عمل رہتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف لبیک لبیک، لاشریک لک لبیک، کہتے ہوئے بڑھیں۔ اور اپنے امام کی زبان سے گھر والے کے اوامر ونواہی سے آگاہ ہوں۔ اسی لئے فرمایا۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو

يَأْتُوكَ — کہ وہ تمھارے پاس آئیں۔

یعنی تمھارے پاس حکمت و معرفت کی باتیں سننے آئیں کیونکہ جس طرح کعبہ لوگوں کے لئے مرکز اور سرچشمۂ برکت و ہدایت تھا، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ لوگوں کے امام تھے اس لئے آپ لوگوں کی میزبانی کرتے تھے اور ان کی اصلاح و ہدایت کے لئے ان کے سامنے خطبہ دیتے تھے۔ ابتدائے بعثت میں آنحضرت صلعم نے تبلیغ دین کے قصد سے اپنے خاندان کے لوگوں کی جو دعوت کی تھی وہ اسی سنت ابراہیمی کی پیروی تھی۔ حج کے دوسرے مراسم کے ساتھ، جیسا کہ ہم سورہ بلد کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں، خطبہ کی یہ سنت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد باقی رہی

پھر نیاز کے جو جانور ساتھ لائے ہیں ان کا گوشت خود کھائیں اور دوسروں کو کھلائیں اور شکرگذار ہوں کہ آقا نے خود اپنی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے سوغات بخشی، پھر خود قبول فرما کر غلاموں کو سرفراز فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس گھر کی تعمیر نہایت عظیم الشان مقاصد کے لئے ہوئی ہے اور خدا نے انہی مقاصد کی خدمت اور تکمیل کے لئے ان کو اس پر قبضہ دیا ہے! ان مقاصد کا لب لباب دو چیزیں ہیں۔ نماز۔ قربانی۔ پس اس عطیہ کے ذکر کے بعد ان دونوں کا ذکر کر دیا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ عطیہ یوں ہی نہیں مل رہا ہے، بلکہ اس کے کچھ حقوق و فرائض

ہیں، جن کا اہتمام اصل مقصود ہے۔ یہ گویا بقائے حقوق کے عام اور معروف قانون کے مطابق ایک مسلم حق کا اظہار کیا گیا، کیونکہ کوئی عطیہ بغیر کسی فرض کی ذمہ داری کے نہیں ملتا۔ جب ہم کچھ لیتے ہیں تو لامحالہ ہم کو کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بھی آمادہ رہنا چاہیئے۔ مندرجہ ذیل آیات کی بنیاد اسی حقیقت پر ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ فِيْمَآ اٰتٰكُمْ	تاکہ تم کو جو کچھ دیا ہے، اس میں آزمائے۔
اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ	اللہ نے جس طرح تم پر احسان فرمایا،
اِلَيْكَ	اسی طرح تم دوسروں کے ساتھ احسان کرو
وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ	اور اس کی کٹائی کے دن اس کا حق دو

۲۔ ربط کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس عطیہ کے ذکر کے بعد اس چیز کا ذکر کیا گیا جو اس کے بقا و قیام کی بنیاد ہے۔ چنانچہ نماز اور قربانی کا حکم تمام امت کے لئے عام ہوا، کیونکہ نعمت بھی پیغمبرؐ اور اس کی امت کے لئے عام تھی۔ پیغمبر، امت کا وکیل ہوتا ہے، اس لئے جو کچھ اس کو ملتا ہے، اس میں امت بھی شریک ہوتی ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا جیسا کہ گذر چکا ہے "میں تمہارے لئے حوض پر آگے جانے والا ہوں"۔ پس یہاں نماز اور قربانی کا حکم عام ہے، یہ بات سیاق کلام سے ظاہر ہے۔

جب کوئی عبادت کسی عطیہ کے ساتھ مخصوص کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی

پابندی ہی اس نعمت کے بقار کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ	اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے وعدوں
حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ	کو اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک
(۱۱۔ رعد)	وہ اپنی ذمہ داریوں میں تبدیلی نہ کردے

(یہاں جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے، ہم کو حج اور اس کے دوسرے آداب مناسک کا حکم دیا گیا ہے، گویا یوں کہا گیا کہ "ہم نے تم کو کوثر بخشا"، پس اس کے حقوق ادا کرو کہ یہ نعمت تمھارے لئے باقی رہے۔ چاہے نماز اور حج کو الگ الگ لو یا دونوں کو ایک ساتھ، مراد اس سے حج ہی ہے۔ کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ حج نماز میں سے ہے۔ حج کے اعمال و مراسم سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ بیت اللہ کا مقصد نماز ہے اور اسی لئے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود اس گھر کا حج نہ کیا، اس نے اس کا مقصد پورا نہیں کیا، بعینہ یہی حال قربانی کا ہے۔ جس نے حج کی قربانی کی سعادت حاصل نہ کی، وہ درحقیقت ٹھیک قربانی سے محروم ہے۔ جو شخص اس قربانی کے علاوہ قربانی کرتا ہے، وہ حجاج سے صرف ایک گونہ تشبہ حاصل کرتا ہے، اور یہ قربانی کرکے گویا وہ ایک دن حقیقی قربانی کی

سعادت کے حصول کی راہ تک رہا ہے۔ بہر حال! جو پہلو بھی اختیار کرو، آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج امت پر لازم ہے، اور جو شخص حج سے بے پرواہوا، اس نے گویا اپنے کو امت کے حلقہ سے الگ کر لیا۔ حج کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد، یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ	اور لوگوں پر، اللہ کے لئے بیت اللہ
مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا	کا حج کرنا ہے جس کو استطاعت ہو،
وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ	اور جو کفر کرے گا، تو اللہ دنیا والوں
عَنِ الْعٰلَمِيْنَ آل عمران (۹۷)	سے بے نیاز ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حج سے بے پرواہونے والا کافر ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ایسے شخص کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کے لئے تسلی ہے۔ گویا ان سے یوں کہا گیا کہ "کفار نے تم کو جوار بیت اللہ سے جلا وطن کیا اور نماز و قربانی سے روکا۔ لیکن اب کہ ہم نے تم کو کوثر بخشا، پورے فراغ خاطر اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ اپنا حوصلہ پورا کر دو" اس سے ایک طرف نماز، حج، قربانی اور دوسرے اعمال

صالحہ کے لئے اس بے تابی کا اظہار ہوتا ہے، جو آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو بے چین کئے ہوئے تھی اور دوسری طرف اس میں بشارت، تسلی اور اظہار محبت کی نہایت جاں نوازادائیں ہیں۔

۴۔ یہ اس عہد کا بیان ہے جس کی ذمہ داری خدا کے عطیہ کے بعد از خود ہم پر عاید ہو جاتی ہے، کیونکہ نماز اور قربانی کے حکم کو خدا نے اپنے عطیہ کے ساتھ گویا مشروط کیا ہے۔ اس لئے جب ہم نے خدا کا عطیہ قبول کر لیا تو اس حکم کو بھی اپنے اوپر واجب کر لیا۔ اور جب تک اس عہد پر قائم رہیں گے، یہ عطیہ بھی ہمارے لئے باقی رہے گا۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے، جیسا آدم و حوا کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا نے ان کو جنت میں سکونت اور ہر چیز سے آزادانہ متمتع ہونے کی اجازت دی لیکن ایک مخصوص درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔ جب انھوں نے خدا کے بخشے ہوئے عطیہ کو قبول کر لیا تو ان کے اوپر خدا کا یہ عہد بھی خود بخود واجب ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عہد سے تعبیر فرمایا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ	اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے
مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ	ایک عہد لیا لیکن وہ بھول گیا،
لَهُ عَزْمًا۔	اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی

چنانچہ یہ عطیہ اسی وقت تک باقی رہا جب تک وہ دونوں اپنے عہد پر باقی رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ — یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے
بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ — چند باتوں میں آزمایا، تو اس نے
اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ — ان کو پورا کیا، خدا نے کہا میں تم کو
اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ — لوگوں کا امام بناؤں گا ابراہیم نے
قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی — پوچھا اور میری ذریت میں سے؟ خدا نے
الظّٰلِمِیْنَ ۝ — جواب دیا میرا یہ عہد ظالموں سے نہیں ہے

جب حضرت ابراہیم نے خدا کے فرمائے ہوئے حکموں کی تعمیل کر دی، خدا نے ان سے ایک عہد باندھا اور فرمایا کہ جب تک ان کی ذریت اس عہد پر قائم رہے گی خدا کا عہد بھی قائم رہے گا۔ اور جو اس کو توڑیں گے، وہ اس کی برکتوں سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

۵۔ پانچواں پہلو یہ ہے کہ یہ عہد توحید کا بیان ہے۔ قرآن نے اس عہد کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس کے دلائل کی تفصیل کی ہے۔ ان دلائل کا عام عنوان یہ ہے کہ وہ پروردگار ہے، اسی نے اپنی نعمتوں سے ہم کو مالا مال کیا،

اس نے ہم کو خلعت وجود سے آراستہ کیا، بہترین ساخت پر پیدا کیا، اور ہمارے لئے رزق طیب کا وسیع خوان کرم بچھایا اس لئے اسی کی عبادت اور اسی کی پرستش کرنی چاہیے لیکن یہاں ایک مخصوص عظیم الشان نعمت کا ذکر ہے اس لئے توحید کا مطالبہ بھی اسی مخصوص پہلو سے کیا گیا ہے۔ یعنی رجحان کلام گویا یوں ہوگا کہ جب خدا ہی نے ہم کو اس گھر کی خدمت و پاسبانی کی عزت بخشی ہے تو نماز و قربانی بھی اسی کے لئے مخصوص ہونی چاہئے۔ اس میں ان مشرکین پر تعریض بھی ہوگی جو اس عہد کو فراموش کر کے غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت "اِنَّآ" (بے شک ہم نے) اور "لِرَبِّكَ" (اپنے خداوند ہی کیلئے) کے الفاظ پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے، یعنی ہم نے تم کو بخشا ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ مشرکین کے برخلاف صرف ہماری نماز پڑھو اور ہمارے ہی لئے قربانی کرو۔ سورۂ حج میں یہ مضمون باربار بیان ہوا ہے۔ یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے بھی آیت کی تفسیر یونہی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"لوگ غیر اللہ کے لئے نماز پڑھتے تھے۔ اور غیر اللہ کے لئے قربانی کرتے تھے۔ جب ہم نے تم کو اے محمدؐ کوثر بخشا تو تمہاری نماز اور قربانی صرف ہمارے لئے ہونی چاہئے۔"

نماز اور قربانی میں باہمی مناسبت

۱۰۔ نماز اور قربانی میں بہت سے پہلو ہیں قرآن نے ان سب کی طرف اشارے کئے ہیں۔ لیکن یہاں ان سب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتاب المفردات میں پوری تفصیل ملے گی۔ اس جگہ ہم ان دونوں کے صرف ان پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے، جن سے ان کی باہمی مناسبت واضح ہو۔

ہر چند قرآن نے ان کو تصریح کے ساتھ نہیں بیان کیا ہے، لیکن جو شخص قرآن کی آیات اور ان کے کلمات کے باہمی نظم پر غور کرے گا وہ کسی طرح ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ غور کے لئے اصلی چیز قرآن کے حسن نظم کا یقین ہے۔ اور تعجب ہے کہ جس قرآن میں یہ آیت بھی موجود ہے:۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے،
اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔	یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے
(محمد ۲۴)۔	ہیں۔

اس پر غور و فکر کرنے سے کوئی شخص کیونکر بے پروا ہو سکتا ہے!۔

اس تمہید سے مقصود یہ ہے کہ یہاں صرف یہ بات کہ خدا نے نماز اور قربانی کا ایک

ساتھ ذکر کیا ہے، ہم کو دعوت دیتی ہے کہ ہم ان دونوں کی باہمی مناسبت پر غور کریں۔ اسی اشارے نے ہمارے سامنے بے شمار حقائق حکمت کی راہ کھول دی۔ ہم اس فصل میں ان کو بیان کرتے ہیں۔ تاکہ ایک طرف آیت کا حسن نظم واضح ہو، اور دوسری طرف ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکیں کہ قرآن کی جو سورتیں اپنے الفاظ کے اعتبار سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اپنے معانی کے اعتبار سے بحر بے کراں ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کی باہمی مناسبت کے تمام پہلوؤں کی تفصیل کی جاتی ہے۔

۱۔ نماز اور قربانی میں اس طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت ایمان اور اسلام میں ہے۔ یہ اجمال ہے؛ اس کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر تمہید سن لینی چاہئے؛۔

دین کی بنیاد علم و عمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں، اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت اور شکر کی ایک قلبی کیفیت و حالت پیدا ہوتی ہے۔ اسی قلبی کیفیت سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح گویا علم و عمل میں وہی تعلق ہے جو اثر اور موثر، ظاہر اور باطن میں ہوتا ہے۔ یعنی علم باب ایمان سے ہے اور عمل باب اسلام سے!

پھر ایک دوسری حقیقت پر غور کرو۔ عمل جس طرح علم کا مقابل ہے، اسی طرح قول کا مقابل ہے یعنی قول، علم و عمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول، ارادہ کا اولین ظہور اور عمل کا عنوان

دیا جاچکا ہے۔ اس تمہید کی روشنی میں، نماز اور قربانی کے باہمی تعلق پر غور کرو۔

(نماز ظاہر ہے کہ قول واقرار ہے، یہ اٹھنا بیٹھنا، جھکنا، سجدہ کرنا، ہاتھ اٹھانا، انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے؟ یہ سب اداؤں کی زبان سے ہمارا قول و قرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد، راہ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے۔ اسی لئے یہ تمام شریعت کے دروازہ کا عنوان قرار دی گئی ہے۔ بہ کثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔ مثلاً۔)

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ	جو غیب میں ایمان لاتے ہیں، اور نماز
وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ ۲	قائم کرتے ہیں۔

تفسیر سورۂ فاتحہ میں اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں اس حقیقت کی پوری تشریح ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو، اس کی صفت توحید کے ساتھ، پہچان لینے کے بعد فرمایا:۔

اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ	میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا	ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور
وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (انعام-۹)	زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں

نماز اسی توجہ الی اللہ کی عملی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے ہماری نمازوں کا عنوان یہی مبارک کلمہ قرار پایا۔ یہی حقیقت حضرت موسیٰ کے قصہ میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کی معرفت بخشنے

کے بعد، فرمایا:-

فَلَمَّآ أَتٰهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى إِنِّيْٓ	پس جب وہ اس کے پاس آیا، ندا آئی،
أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ	اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، پس اپنے
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى وَأَنَا	جوتے اتار دو۔ تم وادی مقدس طویٰ
اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى	میں ہو، اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا،
إِنَّنِيْٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِيْ	پس جو کچھ وحی کی جائے اس پر کان دھرو۔
وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ	میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں
(طٰہٰ - ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ - ۱۴)	پس میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے
	لئے نماز قائم کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ابطال شرک کے بعد فرمایا:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا	اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت الٰہی کی طرف
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	سیدھا کرو۔ یہی اللہ کی فطرت ہے جس پر
عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ	اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اس میں فطرت الٰہی
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ	کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔ یہی فطرت کا
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مُنِيْبِيْنَ	سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اِلَیۡہِ وَاتَّقُوۡہُ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ۔ اسکی طرف متوجہ ہوکر، اور اسی سے ڈرو اور

وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۔ نماز قائم کرو۔ مشرکین میں سے نہ ہو۔

(روم۔ ۳۰۔ ۳۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ ساتوں آسمان اور زمین، اور جو ان

وَمَنۡ فِیۡہِنَّ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا میں ہیں، اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور نہیں ہے

یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ (بنی اسرائیل ۴۴) کوئی شے مگر اس کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ نہیں دیکھتے کہ جو آسمان اور زمین میں ہیں سب اللہ

فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّیۡرُ کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور چڑیاں قطار در

صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ قطار، ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح

وَتَسۡبِیۡحَہٗ (نور۔ ۴۱) جان لی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تمام اعمال میں سے نماز ایمان سے سب سے زیادہ اقرب، بلکہ ایمان کا اولین فیضان ہے۔ یہ بیک وقت توحید، انابت، شکر، توکل اور تبتل الی اللہ کا شیرازہ اور تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔

ز اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو! قربانی حقیقت اسلام کی جامع ہے۔ اسلام کا مفہوم، اطاعت، سرافگندگی، اور نفس کو بالکلیہ مولیٰ کے حوالہ کر دینا ہے۔ نماز کی طرح یہ بھی بندوں کی فطرت ہے، کیونکہ تمام مخلوق امرالٰہی کی اطاعت سے وجود میں آئی ہے۔ خدا نے کلمہ "کن" کے ذریعہ حکم دیا اور تمام مخلوق بدء خلقت میں اس کلمہ کی اطاعت سے وجود میں آئی ہے اب اگر وہ خدا کی نافرمانی کرے، تو اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرے گی۔ اس اعتبار اسلام تمام کائنات کو محیط ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	آسمان اور زمین میں جو ہیں، سب
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا	طوعاً و کرہاً اسی کے سامنے سرافگندہ
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (آل عمران ۸۳)	ہیں اور اسی کے پاس سب لوٹائے جائیں گے

یعنی بدء خلقت میں تم نے اس کے امر کی تعمیل کی، اسی طرح آخرت میں اس کے حکم پر دوڑو گے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ	جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لئے
اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (روم ۲۵)	ایک بار پکارے گا، دفعۃً تم نکل کھڑے ہوگے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ	اور تم اس کی حمد کے ساتھ اس کی پکار

وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا — پر دوڑو گے اور گمان کرو گے کہ نہیں

(بنی اسرائیل - ۵۲) — تم ٹھیرے مگر بہت کم۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور تسبیح وسجدہ اور نماز دونوں عین فطرت اور باہمدگر نہایت قریبی رشتہ دار ہیں۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امام، ان کی مسجد کو ہمارا قبلہ اور ان کے طریقہ کو ہمارے لئے دستورالعمل بنایا تو ایک واقعہ بیان کر کے قربانی کی حقیقت بھی آشکارا کر دی جس سے ضمناً نماز کے باطن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا۔

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ — میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں،

. . . . وہ میری رہبری فرمائیگا۔ (یعنی میں اپنے

. . . . پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ

. . . . مجھ پر اپنی راہ کھولے گا)۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ — اے پروردگار مجھے صالحین میں سے بخش۔

. . . . (یعنی اولاد صالح، تاکہ میں ان کو لیکر تیری

. . . . راہ پر چلوں، اور لوگوں کے لئے حق و ہدایت

. . . . کی راہ باز ہو)۔

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ — پس ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی ولادت کی
بشارت دی (یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی۔ اسمٰعیل کے
معنی ہیں، "اللہ نے سنا"، چونکہ ان کی ولادت
ابراہیم کی دعا کے مطابق ہوئی تھی، اس لئے
ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا)۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ — جب وہ اس عمر کو پہنچے کہ ان کے ساتھ دوڑ پھر
يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ — سکیں۔ انھوں نے کہا: بیٹے! میں نے خواب
أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا — میں یوں دیکھا کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں
تَرَىٰ — (یعنی اللہ کے لئے) اب تم بتاؤ تمہاری کیا
رائے ہے؟۔

(یہ سوال اس لئے تھا کہ اس طاعت میں فرمانبردار بیٹا بھی برابر کا شریک ہو جائے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ کے لئے تسلیم و اطاعت الٰہی کی ایک راہ کھول رہے تھے۔ اور چونکہ اطاعت شعار فرزند دعا ہائے سحر کی قبولیت تھا، اس لئے اس کا عاقل و حلیم ہونا متیقن تھا یہ اندیشہ نہ تھا کہ اس کو اس بندگی سے اختلاف ہوگا)۔

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ — انھوں نے جواب دیا: والد! جو حکم

سَتَجِدُنِیٓ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ .... ملاحظہ اس کی تعمیل فرمایئے انشاءاللہ آپ مجھ کو ثابت قدموں میں پائیں گے۔

حضرت اسمٰعیل سمجھ گئے کہ ان کو حکم الٰہی کی تعمیل میں ذبح کیا جارہا ہے۔ اس لئے انھوں نے وہ جواب دیا جو تسلیم کے شایان شان تھا۔

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ .. .. پس جب دونوں امر الٰہی کے سامنے جھک گئے اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔

یعنی اس طرح دونوں نے اپنے کمال اطاعت و اسلام کو مشہود کردیا کیونکہ باپ نے اس چیز کو قربان کرنے کا عزم کرلیا، جو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی، اور بیٹے کی کل کائنات صرف اس کی جان ہی تھی۔

وَنَادَیۡنٰهُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ ..... اور ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، بیشک ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں، بلاشبہ کھلی ہوئی جانچ یہی ہے۔

(اس اطاعت کاملہ نے ان کو درجۂ احسان کی سرفرازی بخشی۔ اور یہی کمال اسلام سے

اس امتحان کے بعد ان دونوں کو خدا نے قوموں کا امام اور ہادیوں کا رہبر بنایا۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صٰفٰت ۱۰۰) — اور ہم نے اس کو بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا۔

یعنی اس قربانی کی یادگار میں، قربانی کی عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم کی، جو قربانی کرنے والوں کی مغفرت کا وسیلہ ہے۔

اس سرگذشت میں خدا نے ہمارے سامنے یہ حقیقت کھولی ہے کہ اسلام کی روح، اطاعت اور اپنی عزیز سے عزیز متاع حتی کہ جان کو بھی خدا کے حوالہ کر دینا ہے۔ اور یہ بات بغیر کامل ایمان و اخلاص کے وجود میں نہیں آسکتی۔ پس گویا ان دونوں کا رتبہ کمال مقام احسان ہے۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ "اعبد ربك كانك تراه" اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور نماز میں وہی تعلق ہے۔ جو تعلق ایمان و اسلام میں یا قول و عمل میں ہے۔ اور احسان ان دونوں کا نقطۂ اتصال ہے۔

۲۔ نماز اور قربانی میں وہ نسبت ہے، جو نسبت زندگی اور موت میں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یاد الٰہی ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ) — اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔

دوسری جگہ ہے:۔

ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى
(اعلیٰ ۱۵)

اپنے رب کے نام کو یاد کیا پس نماز پڑھی

قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں، اور مقصود دوام ذکر الٰہی ہے۔

چنانچہ فرمایا:-

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ
قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی
جُنُوْبِهِمْ (آل عمران ۱۹)

جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔

نیز فرمایا:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا
اللّٰهَ ذِکْرًا کَثِیْرًا وَّسَبِّحُوْهُ
بُکْرَةً وَّاَصِیْلًا هُوَ الَّذِیْ
یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ
لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ
رَحِیْمًا (احزاب ۴۱ تا ۴۳)

اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح پڑھو۔ وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں، تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لیجائے، اور وہ مومنین کے ساتھ مہربان ہے۔

....

یعنی جس طرح تم اس کی یاد کرتے ہو، اور اس کی تسبیح پڑھتے ہو، اسی طرح وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں جس سے تمھاری روشنی بڑھتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔ (بقرہ ۱۵۲) پس مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔

نیز فرمایا:۔

فَالَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ — جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں وہ رات دن
لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ — اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور کسی وقت
لَا يَسْأَمُونَ (حم سجدہ ۳۸) — اس سے برداشتہ خاطر نہیں ہوتے۔

یہی راز ہے کہ ہمارے رات دن کے تمام اوقات نمازوں سے گھیر دیے گئے ہیں۔ اور کسی حالت میں اس سے معافی نہیں دی گئی ہے۔ نماز سانس کی طرح زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، صرف اللہ کی یاد ہی سے باقی رہ سکتی ہے۔ غور کرو تو عقلاً یہ بات بالکل واضح ہے کیونکہ بندوں کو عقل و تمیز کی صلاحیت بخش دینے کے بعد خدا کی نظر رافت ان کی طرف اس وقت تک ملتفت نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی توبہ و انابت سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے اور پائی ہوئی نعمتوں کو کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ — جو طالب ہدایت میں سرگرم رہتے ہیں

هُدًى (محمد - ۹۰) ان کے نور ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

توجہ الی اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا کے تقرب کی راہ یہی ہے۔ اللہ سے قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت ہو جائے (اعاذنا اللہ منہا) جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے اس سے قریب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (علق-۱۹) سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔

اس وقت اللہ کی نظر رحمت اس کو نوازتی ہے۔ اس کا سینہ انوار قدس کا مہبط بن جاتا ہے۔ روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی جاتی ہے، زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر قریب ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے۔

مایزال العبد یتقرب	بندہ نوافل کی راہ سے برابر میری طرف
الی بالنوافل حتی احبتہ	بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب
فاذا احببتہ کنت سمعہ	بنا لیتا ہوں، اور جب میں اسکو محبوب بنا
الذی بہ یسمع وبصرہ الذی	لیتا ہوں تو اس کا کان بنجاتا ہوں جس سے
بہ یبصر ویدہ التی بھا	وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بنجاتا ہوں جس سے
یبطش	وہ دیکھتا ہے، اور اسکا ہاتھ بنجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے، جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ اور اس حیات سفلی سے نجات حاصل کرنے کا زینہ ہے۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو! اس کا اصلی مفہوم جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی سرگذشت سے ظاہر ہے، نفس کو اللہ کے حوالہ کرنا ہے۔ یہ تسلیم و اطاعت کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے۔ اور اس میں اس زبردست امتحان کی سرگذشت پنہاں ہے جس میں خدا نے ابراہیمؑ کو آزمایا تھا۔ اہل ایمان، راہِ الٰہی میں اپنی جانیں قربان کر کے، اسی اطاعت و عبدیت کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ پس جس طرح نماز اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے، اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے۔ اور یہی حقیقی دین اور حقیقی اسلام ہے جو فرمایا:-

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰانِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ

کہدو میرے رب نے مجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی، سیدھے دین، دین ابراہیم کی جو صرف اللہ کا پرستار تھا، اور مشرکین میں نہ تھا۔ کہدو میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ رب

وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — رب العالمین کے لئے ہے۔

(انعام۔۱۶۱-۱۶۲)

باتفاق تمام مفسرین اس آیت میں "نسک" سے مراد، حج اور عمرہ میں، قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں "صلوۃ" اور "نسک" کو ایک ساتھ رکھا ہے۔ اور اس کے بعد علی الترتیب "محیا اور ممات" کے الفاظ ہیں۔ یہ نظم کلام، توافق کے اصول پر، ان دونوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو بے نقاب کرتا ہے۔ یعنی نماز، مسلم کی زندگی ہے اور اس کی قربانی راہ الٰہی میں اس کی موت ہے۔ پھر غور کرو تو یہ دونوں بالکل ایک ہیں، کیونکہ یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ — جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں،
سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ — ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن
وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ ۱۵۴) — تم محسوس نہیں کرتے۔

۳۔ نماز اور قربانی، "حقیقی قربانی" کے دو بازو ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو صاحب عقل و ارادہ اور خیر و شر میں تمیز کرنے والا بنایا، تو ایک طرف تو اس کو عظمت و رفعت کا وہ مقام بلند بخشدیا جس سے برتر اور بلند کوئی مقام نہ تھا، دوسری طرف ذلت و پستی کے اس کنارہ پر کھڑا کر دیا، جس سے بڑھ کر کوئی ذلت و پستی نہ تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ
اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ
اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ
اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (تین ۴-۵-۶)

بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے
اچھی بنائی، پھر ہم نے اسے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ
میں ڈال دیا، مگر جو کہ ایمان لائے، اور بھلائیاں
کیں، سو انہیں ہمیشہ کیلئے انعام
ملے گا۔

نیز فرمایا:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ
زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا
(شمس ۷-۸-۹-۱۰)

اور شاہد ہے نفس اور اس کا تسویہ چنانچہ
اس کو اس کی بدی اور نیکی الہام کی جس نے
اس کو سنوارا، اس نے فلاح پائی جس نے
اس کو خاک میں ملایا، وہ نامراد ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب اس منعم حقیقی سے بے پروا ہو جاتا ہے، جمال الٰہی کی روشنی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور وہ باطل کے دام فریب میں پھنس کر اپنے تئیں ہوائے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:۔

اَفَمَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ
وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ (جاثیہ ۲۳)

کیا وہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا ہے اور
خدا نے اسکو علم دینے کے باوجود گمراہ کر دیا ہے

یعنی اس نے عقل، آنکھ، کان پاکر گمراہی کی راہ اختیار کر لی ہے، جیسا کہ سورۂ دہر میں ہے

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ	ہم نے آدمی کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا،
نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ	اسکو مختلف اطوار میں الٹتے پلٹتے رہے، پس
فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا	اسکو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا، بیشک ہم نے
اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا	اسکو راہ سوجھا دی چاہے وہ شکر گذار بنے یا ناشکری
شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (دہر-۲-۳)	کی راہ اختیار کرے۔ (یعنی اگر وہ خدا کی بخشی ہوئی
. . . .	نعمتوں کو کام میں نہ لائے گا ناشکری کی راہ
. . . .	اختیار کرے گا) ۔
وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ	اور اس کے کان، اور دل پر مہر کر دی،
وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً	اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ پس
فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ	اللہ کے بعد اسکو کون ہدایت کی راہ دکھائیگا
اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (جاثیہ-۲۳)	تم لوگ سوچتے نہیں ؟ ۔

(یعنی جب اس نے خدا سے مُنہ پھیر لیا، اور اپنے نفس کا غلام بن گیا تو خدا نے اس کو اسکی خواہشوں کے حوالہ کر دیا، جو اس کے قلب کے لئے حجاب بن گئی ہیں۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے

مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ. كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُوْنَ (مطففین - ۱۴ - ۱۵)

اعمال کی سیاہی جم گئی ہے، ہرگز نہیں! وہ اس دن اپنے پروردگار کے دیدار جمال سے محروم ہوں گے۔

یعنی جس طرح وہ اس حیات دنیاوی میں خدا کے نور ایمان سے محروم تھے، اسی طرح حیات اخروی میں اس کے دیدار جمال سے اوٹ میں ہوں گے۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے خدا کی طرف سے وہی پاتا ہے۔ جنھوں نے نفس اور شہوات نفس کی غلامی پسند کی، وہ نفس کے غلام بن گئے، اور قیامت کے دن نفس کی حقیقت ہی سے دوچار ہوں گے یعنی ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ۔ پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اس حالت کی وجہ سے انسان کے لئے ضروری ہوا کہ نفس کے صنم اکبر کو توڑے، اور جنھوں نے نفس کی حقیقت پر غور کیا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ نفس کے دو بازو ہیں۔ سبعیت اور بہیمیت۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان کو ان دونوں بازوؤں کے توڑنے کی تدبیر بتائی جائے۔

اب ان دونوں کی تفصیلات پر غور کرو!

۱۔ اول یعنی سبعیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ کے حضور خشوع و تذلل اور نماز کی پابندی ہر نفس کے کبر و نخوت کا سر صرف نماز سے کچلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خشوع نماز کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ
(مومنون - ۱ - ۲)

بیشک ان ایمان والوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں میں خدا کے سامنے سرافگندہ ہیں۔

نیز فرمایا ہے :-

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ (اعراف ۲۰۵ - ۲۰۶)

اپنے رب کو دل ہی دل میں یاد کرو، گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور پست آواز میں صبح اور شام، اور بے خبروں میں سے مت بنو۔ جو لوگ تمہارے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے انکار نہیں کرتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے :-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ

اور خدائے رحمٰن کے بندے وہ ہیں،

عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ	جو زمین پر خاکساری کے ساتھ چلتے ہیں، اور
الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا	جب جاہل ان کو مخاطب کرتے ہیں تو
وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ	وہ کہتے ہیں تم پر اللہ کی سلامتی ہو، اور
سُجَّدًا وَقِيَامًا۔ (فرقان -۶۳- ۶۴)	جو اپنی راتیں خدا کے حضور سجدہ و قیام میں بسر کرتے ہیں۔

اس آیت پر غور کرو۔ اس میں نماز سے پہلے ان کی خاکساری کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ نماز کی حقیقت نفس کو نخوت سے پاک کرنا ہے۔ جو لوگ برابر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور خدا کے جلال و جبروت اور اس کی نعمت و رحمت کی یاد تازہ رکھتے ہیں، ان کے چہروں سے تواضع اور محبت کا جمال ٹپکتا ہے۔ اسی قسم کا نظم اس آیت میں ہے:-

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ	محمد اللہ کا رسول، اور جو اس کے ساتھ
مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ	ہیں، کافروں پر سخت ہیں، آپس میں
رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا	نرم دل ہیں، تم ان کو دیکھو گے رکوع
سُجَّدًا۔ (فتح - ۲۹)	اور سجدہ میں۔

یہاں ابطال رہبانیت کی غرض سے پہلے "شدت" کا ذکر کیا ہے، کیونکہ جو خدا [illegible]ست کرتا ہے اس کا دل اس مقام کی بے پایاں عظمتوں کے احساس سے اس قدر

لبریز ہو جاتا ہے کہ اس میں دوسروں کی عظمت و بڑائی کے خیال کی سمائی نہیں رہ جاتی اس لئے وہ تمام مخالفتوں سے نڈر ہو کر علی الاعلان اس کی شہادت دیتا ہے پس اس جگہ شدت کے ذکر محض ایک وہم کے ازالہ کے لئے ہے، کیونکہ تذکرہ ایک ایسی امت کا ہو رہا تھا، جو اعتدال کے نقطۂ کمال پر ہے۔ آیت میں مسلمانوں کی وہ صفات بیان ہوئی ہیں، جو توراۃ وانجیل میں مذکور ہیں، اور جو اس کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی امتوں سے تمیز کرتی ہیں۔ ضمناً اس میں کمال عدل واعتدال اور جمع بین الضدین کی اس فضیلت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، جو امت مرحومہ کی خصوصیات خاصہ میں سے ہے، اور جس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا، پس اس جگہ "شدت" کے ذکر سے محض اس صفت تواضع ورحمت کی تصحیح مقصود ہے، جس کا سرچشمہ خشیت الٰہی ہے، کیونکہ خدا کی خشیت تمام خوفوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ	پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے
(آل عمران - ۱۷۵)	ڈرو۔
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ	پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ
(مائدہ - ۳)	سے ڈرو۔

اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔

۲۔ دوسرے باز وینی بہیمیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ نفس اس دنیا کی جن مرغوبات میں لذت پاتا ہے، ان سے اس کو علیحدہ کیا جائے۔ اس کے تین درجے ہیں:۔

پہلا یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان قربان کی جائے۔ اس کا بلند ترین مقام لخت جگر کی قربانی ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے جانچا گیا، جو ان کی محبوب ترین اولاد تھے۔ چنانچہ جب فرشتہ نے ان کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی، انھوں نے کہا "اسمٰعیل زندہ رہے" جس سے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ ان کی بے اندازہ محبت کا جوش ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ طاعت الٰہی کی راہ میں مصائب و آلام جھیلے جائیں، اور لذات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے، کیونکہ زندگی کے بعد نفس کو سب سے زیادہ محبوب لذات ہی ہیں۔ روزہ اس منزل میں بہترین رہبر ہے۔ مقام قربانی کے مدارج میں سے ضعفاء طالبین کی پہنچ اسی درجہ تک ہے، اسی لئے جب حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ سب سے بلند درجہ کے حصول کی راہ کیا ہے تو انھوں نے فرمایا یہ روزہ اور نماز سے حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ بذل مال کا ہے، جو تمام لذات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس منزل میں رہبر زکوٰۃ ہے۔ متعینہ زکوٰۃ سے زیادہ خرچ کرنے میں ایک پہلو، سبب کبر کے ابطال

کا بھی ہے۔ چونکہ مقصود ذبح بہیمیت سے نفس کو ان چیزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے، جن کی لذتیں اس پر گھیرے ڈالتی ہیں اس لئے ضروری ہوا کہ خدا کی راہ میں وہ چیز خرچ کیجائے جو نفس کو محبوب ہو۔ اسی لئے فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران - ۹۲)

تم اس وقت تک نیکی کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے۔ جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو، جو تمھیں محبوب ہیں۔

یہ جو قربانی کے جانوروں کو فربہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں یہی حکمت مرعی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو محبوب ترین اولاد کے ذبح کا حکم دے کر یہ حقیقت بالکل آشکارا کردی گئی۔ چونکہ قربانی کا حقیقی مرتبۂ کمال جان کی قربانی تھا۔ اس لئے خون بہانا، اس کی علامت قرار پایا۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز اور قربانی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذبح نفس کے دو پہلو ہیں، ایک حدیث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قربان هذه الامة بدماها وصلوتها

اس امت کی قربانی، بذل نفس اور نماز کے ذریعہ ہے۔

۲۔ نماز اور قربانی دونوں ایک دوسرے پر مشتمل ہیں یعنی نماز ایک پہلو سے قربانی ہے اور قربانی ایک پہلو سے نماز ہے۔ نماز کا قربانی ہونا واضح ہے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ نماز

سبعیت کے ذبح کی ایک تدبیر ہے۔ نیز یہ نفس کو تحمل شدائد اور ترک لذات کا خوگر بناتی ہے۔ جز ذبح بہیمیت ہے۔ اس لئے اس کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ قربانی کا نماز ہونا محتاج تفصیل ہے۔ یہ بات گذر چکی ہے کہ قربانی کی حقیقت، راہ الٰہی میں جان کی قربانی ہے، اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری صورت میں بعینہ نماز ہے۔ اس میں زبان اور اداؤں کے ذریعہ اقرار ایمان ہے۔ اس میں اسی ایمان کی تصدیق جان دیکر کی جاتی ہے۔ اسی لئے خدا کی راہ میں جان دینے کا نام شہادت ہے۔ نیز اس میں کمال درجہ خضوع و طاعت ہے، اس لئے نماز کی اصلی روح، اقرار توحید اور خضوع کی یہ سب سے زیادہ حامل ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام آداب بھی اس کے نماز ہونے کی شہادت دیتے ہیں، مثلاً

(۱) ۔ قربانی خانہ کعبہ کے پاس ہوتی ہے، جو مرکز نماز ہے۔

(۲) ۔ اس کا آغاز بسم اللہ و اللہ اکبر ہے۔

(۳) قربانی اور قربانی کرنے والے کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

(۴) اونٹوں کی قربانی میں قیام کی رعایت ہے، جس میں قیام نماز کی جھلک پائی جاتی ہے۔

(۵) مینڈھوں کی قربانی میں سجدہ کی رعایت ہے، جو سجدہ نماز سے اشبہ ہے۔

پھر آغاز نماز کی دعا، جو قرآن میں وارد ہے، یہ ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ　　　میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ

فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام-۷۹) ....

اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

نیز:-

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ (انعام ۱۶۲-۱۶۳)

بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ رب العالمین کیلئے ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا:-

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (صٰفٰت-۱۰۳)

جب ان دونوں نے امر الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔

یعنی ان کے ظاہر و باطن دونوں خدا کی طرف متوجہ ہو گئے، اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو سجدہ میں ڈال دیا۔

اسی طرح قربانی کے ذکر میں فرمایا:-

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (حج - ۳۵)

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ ان میں تمہارے لئے بھلائیاں ہیں۔ پس ان پر دراں حالیکہ وہ صف بصف ہوں، اللہ کا نام لو

یعنی جس طرح تم نمازوں میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہو، اسی طرح وہ بھی ذبح کیوقت صف بستہ کھڑے کئے جائیں۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بیان میں، جو قربانی کے ذیل کی عبادت ہے، فرمایا:-

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔

اور وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درانحالیکہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔

یعنی زکوٰۃ دیتے وقت ان کی ہیئت سے خشوع کا اظہار ہوتا ہے متکبر اور طالبِ شہرت اغنیاء کی طرح تن کر نہیں دیتے۔

(۵) نماز اور قربانی دونوں ذکر الٰہی ہیں۔ نماز کا ذکر ہونا متعدد آیات سے واضح ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ - ۱۴)

اور میری یاد کیلئے نماز قائم کرو۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ ۱۵)

اور اس نے اپنے ربّ کے نام کو یاد کیا پس نماز پڑھی

باقی رہا قربانی کا ذکر ہونا۔ سو یہ بھی قرآن سے ثابت ہے۔ فرمایا۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُم — اور اللہ کے نام کو یاد کریں، ان چوپایوں

مِنْ بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ (حج۔ ۳۴) — پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا — اسی طرح ان کو تمہارے لئے مسخر کیا تاکہ

اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (حج۔ ۳۷) — تم اس ہدایت پر جو اللہ نے تم کو بخشی ہے

.... — اس کی بڑائی کرو۔

یعنی دین توحید اور اسلام کی ہدایت پر۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تکبیر کے ذریعہ ہم نماز میں ذکر الٰہی کرتے ہیں بعینہٖ اسی طرح قربانی کے وقت بھی کرتے ہیں۔

(۶) یہ دونوں (نماز اور قربانی) شکر ہیں۔ نماز کا شکر ہونا بالکل ظاہر ہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہ شکر ہی کے لفظ سے نماز کو تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي — پس مجھ کو یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھونگا،

وَلَا تَكْفُرُونِ (بقرہ۔ ۱۵۲) — اور میرا شکر کرو، ناشکری مت کرو۔

سورۂ فاتحہ نماز کی جان ہے، اور معلوم ہے کہ اس سورہ کی بنیاد شکر پر ہے۔ اب قربانی پر غور کرو! یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور دنیا والوں سے بالکل مستغنی ہے۔ وَهُوَ يُطْعِمُ

وَلَا یُطْعَمُ۔ وہ کھلاتا ہے لیکن کھاتا نہیں، اس نے جو نعمتیں ہم کو بخشی ہیں، ان میں سے کچھ ہم اس کی راہ میں محض اس اعتراف کے لئے قربان کرتے ہیں، کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب اس کی ملکیت اور اس کے انعام کا فیضان ہے۔ اسی وجہ سے قربانی کے وقت ہم کہتے ہیں:۔

"مِنْكَ وَلَكَ" تیری بخشی ہوئی نعمت اور تیری ہی راہ میں۔ اسی لئے فرمایا ہے:۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ — اسی طرح ہم نے ان کو مسخر کیا،
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (حج۔ ۳۶) — تاکہ تم شکر کرو۔

اور جس طرح نماز اللہ کی تمام ظاہر و باطن نعمتوں پر ایک عام شکر ہے اسی طرح قربانی بھی محض منافع دنیاوی کا شکر نہیں ہے بلکہ عموم شکر کا وہی پہلو اس میں بھی مرعی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ — تاکہ تم کو جو ہدایت بخشی ہے۔ اس پر اللہ کی
(حج۔ ۳۷) — بڑائی کرو۔

(۷) یہ دونوں تقویٰ کی فرع ہیں۔ جس سے آدمی کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں، یا جس سے ڈرتا ہے، اس کو برابر یاد رکھتا ہے۔ اور نماز اسی ذکر کے قائم رکھنے کے لئے ہے، چونکہ بندہ کو خدا کی رضا مطلوب ہوتی ہے، اور اس کے غضب سے ڈرتا ہے، اس لئے وہ اس کے سامنے

روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے :-

وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّقُوْہُ | اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور اس سے
وَاِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (انعام-۷۲) | ڈرو، اور وہی ہے جس کے پاس تم جمع کیے جاؤ گے

اب قربانی کو دیکھو! اللہ تعالیٰ نے بہائم پر انسان کو جو غلبہ اور تسلط دیا ہے، اس میں ایک قسم کی آقائی اور بندگی کی نمود تھی۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اظہار خشوع اور اقرار بندگی کے ذریعہ اس غرور کو مٹا دیا جائے، اور بندہ کی زبان پر شکر نعمت اور اقرار عبدیت کے ایسے کلمے جاری کئے جائیں، جن سے خدا کی ملکیت اور پروردگاری اور اس کی وحدت و یکتائی کا اظہار ہو۔ غور کرو! ان تمام امور میں تقویٰ کی کس قدر جلوہ گری ہے! پس چونکہ وہ ان تمام حقائق کا جامع تھا، اس لئے وہی قربانی کی حقیقت قرار پایا۔ بندہ تقویٰ ہی کی راہ سے قرب الٰہی کے مقام شرف تک پہونچتا ہے۔ اس لئے کوئی قربانی اس وقت تک قبول نہیں ہوتی، جب تک کہ اس میں تقویٰ نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا :-

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (مائدہ-۲۷) | اللہ صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے :-

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ | اور تقویٰ کا زاد راہ لو، کیونکہ بہترین

زاد راہ تقویٰ ہے۔ التَّقْوٰى (بقرہ۔ ۱۹۷)

تقویٰ کو زاد راہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ یہی قرب الٰہی کی منزلوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ یہ تقریب، تقرب کے لئے ہے، جیسا کہ گیارہویں سبب میں ہم لکھیں گے۔ اس لئے تقویٰ کا زاد راہ ناگزیر ہوا۔

۸۔ یہ دونوں منازل آخرت میں سے ہیں۔ کیونکہ نماز رجوع الی اللہ اور حشر میں پروردگار کے حضور، ہمارے کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اس لئے اس میں معاد کی ایک جھلک ہے، گویا وہ خدا کے سامنے اپنی حاضری کے دن کو یاد کر رہا ہے۔ یہ اشارہ مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى	بے شک وہ (نماز) گراں ہے، مگران
الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ	خوف رکھنے والوں پر جن کو گمان ہے
اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ	کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور ایک
اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ (بقرہ۔ ۴۵-۴۶)	دن اس کی طرف لوٹنا ہے۔

جن کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے تمام اعمال و اقوال کی جوابدہی کرنی ہے، وہ تمام غفلتوں اور معاصی سے تائب ہو کر اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں، اور حشر کے دن، خدا کے حضور کھڑے ہونے کی خشیت اور پستی دنیا میں ان پر طاری

ہو جاتی ہے۔

قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ
اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (نازعات ۸)

دل اس دن مضطرب ہوں گے اور
نگاہیں پست ہوں گی۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ
هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون ۱-۲)

ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی
نمازوں میں سرفگندہ ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ
لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ
يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ
الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔
(نور ۳۷)

ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور
بیع اللہ کی یاد سے، نماز قائم کرنے سے
اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی،
وہ اس دن سے ڈرتے ہیں۔ جس
دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے

. . . .

یہ آیت بھی اسی کے مشابہ ہے:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى اَنْ
رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ
الرُّجْعٰى اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى

بے شک انسان سرکشی کرتا ہے، اس
وجہ سے کہ وہ اپنے کو مستغنی دیکھتا ہے،
بے شک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے۔

عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى (علق ۱۰:۹۶) ...... (یعنی جس کو خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے) وہ کیسے بے پروا ہوتا ہے) تم نے اسکو دیکھا! جو ایک بندہ کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ خدا حشر کے دن جب ہم کو پکارے گا، ہم اس کی حمد پڑھتے ہوئے قبروں سے نکل کر اس کی طرف بھاگیں گے۔

یَوۡمَ یَدۡعُوۡکُمۡ فَتَسۡتَجِیۡبُوۡنَ بِحَمۡدِہٖ وَتَظُنُّوۡنَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا (اسرا۔ ۵۲) — جس دن وہ تم کو پکارے گا، تم اس کی حمد پڑھتے ہوئے اس کی طرف دوڑو گے اور خیال کرو گے کہ تم بہت کم ٹھیرے۔

اسی طرح نمازی نماز کی پکار کی طرف لپکتے ہیں اور صف بستہ ہو کر خدا کی حمد کرتے ہیں۔

بعینہ یہی حقیقت قربانی میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ بھی نماز کی طرح رجوع الی اللہ ہے، جیسا کہ دوسرے اور تیسرے سبب کے بیان میں مذکور ہو چکا ہے۔ یہاں اس پر ہم ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں گے۔

جس طرح بہائم کو خدا نے ہمارے لئے مسخر کیا ہے، اسی طرح ہمارے اجسام کو بھی ہمارے لئے مسخر کیا ہے۔ تاکہ ایک متعین مدت تک کے لئے رفق اور حسن سلوک کے ساتھ

ہم ان کو اپنا مرکب بنائیں اور پھر خدا کے حوالہ کر دیں۔ انعام کے بارہ میں فرمایا:۔

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى — تمہارے لئے ایک متعین مدت تک کے لئے

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ — ان میں منفعتیں ہیں، پھر ان کو خدا کے

(حج۔ ۳۳) — قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

پس جس طرح قربانی کے جانوروں کو ہم بیت اللہ کی طرف لے جاتے ہیں، اسی طرح اپنے اجسام کو بھی لے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ — اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ کہ

رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ — آویں تمہارے پاس پیادہ پا اور لاغر

مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۔ (حج۔ ۲۷) — اونٹوں پر جو آئیں گے گہرے راستوں سے۔

دیکھو! دونوں کی سمت سفر ایک ہی ہے۔ اور یہ اشتراک ہر چیز میں نمایاں ہے۔ جس طرح قربانی کے جانوروں کی ہم حرمت کرتے ہیں، اور ان کے لئے ایک مخصوص شعار قرار دیتے ہیں بعینہ وہی معاملہ اپنے جسموں کے ساتھ کرتے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ہم جانوروں کی طرح اپنے جسموں کو ذبح نہیں کرتے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانوروں کا فدیہ دیکر ان کو چھڑا لیتے ہیں، جس طرح اسمٰعیل کی جان اس چیز کے عوض میں چھڑائی گئی، جو ان کی قائم مقام بن کر قربان ہوئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ابراہیم نبیل کا

ہدیہ ایک دوسری شکل میں قبول فرمایا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے گھر کی خدمت کے لئے مخصوص فرمایا، اسی طرح ہم بھی اپنے جسموں کو فدیہ دیکر چھڑا تو لیتے ہیں لیکن وہ ہم کو واپس نہیں کر دئے جاتے، بلکہ ہماری امانت میں دے دئے جاتے ہیں۔ تاکہ جب ضرورت پیش آئے ہم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر سکیں۔ قرآن مجید میں، اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ	جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے
الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ	خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد
اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ	کرتے ہیں۔ پس قتل کرتے ہیں اور شہید
وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ	ہوتے ہیں۔ یہ ایک سچا اور پکا عہد ہے
وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَ	اور توراۃ، انجیل، قرآن میں مذکور ہے
مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ	جنھوں نے اللہ سے اپنے عہد کو پورا کیا،
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ	ان کے لئے ہمارا پیام یہ ہے کہ اپنے اس
بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ	معاملہ کی جو تم نے کیا ہے خوشخبری حاصل
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (توبہ۔ ۱۱۱)	کرو۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسلام کی بیعت کے بعد ہم خدا کے ہاتھ بک جاتے ہیں، اور اسی عہد کی تجدید کے لئے ہم اس کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں، اور حجر اسود کو ہاتھ لگا کر اس کا از سر نو اقرار کرتے ہیں یہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے عہد کی توثیق اور ہمارے، اللہ کی راہ میں، قربان ہونے کا اعتراف ہے۔ پھر، حج کا اجتماع ہمارے حشر کے میدان میں کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اس پہلو سے نماز، حج، اور قربانی، ان تینوں کو معاد سے قریبی نسبت ہے۔

۹- یہ دونوں ابواب صبر میں سے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے وعدہ پر پورا بھروسہ کر کے نماز کی مداومت کرتا ہے، اس کی مثال اس درخت لگانے والے کی سی ہے، جو شب و روز پودے کی نگہداشت کرتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، اس کو پانی دیتا ہے، اور اس کے پھل کا منتظر ہے، اور دوسروں کی غفلت و سرمستی اس کی اس سرگرمی و خود فراموشی میں کوئی ضعف نہیں پیدا کرتی۔ لوگ اس کی امید موہوم پر ہنستے ہیں۔ لیکن خدا کی شکر گذاری و طاعت کے جادۂ مستقیم سے اس کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں غیر معمولی رسوخ عزم اور انجام کار کی کامیابی پر غیر متزلزل یقین کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتیں۔ انہی وجوہ سے قرآن مجید نے صبر اور نماز کو متعدد آیات میں ایک ساتھ ذکر کیا ہے:۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ اور صبر و نماز

کے ذریعہ مدد چاہو۔

اوپر ہم نے جن امور کی تشریح کی ہے، مندرجہ ذیل آیت میں ان کی طرف نہایت واضح اشارات ہیں:۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ	پس ان کی باتوں پر صبر کرو، اور اپنے
سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ	رب کی حمد کی تسبیح پڑھو، سورج کے نکلنے
الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ	سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور
اٰنَاۤءِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ	رات کے وقتوں میں اس کی تسبیح پڑھو۔
النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى وَلَا	اور دن کے اطراف میں تاکہ تم خوش
تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا	ہوجاؤ۔ اور تم نہ دیکھو اس زینت دنیا
مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ	کی طرف جو ہم نے ان کی بعض جماعتوں
زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ	کو بخشی ہے، تاکہ ہم اس کے ذریعہ ان کا
فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ	امتحان کریں۔ تمہارے رب کی روزی
اَبْقٰى ۝ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ	زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ اور
وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ	اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت
رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۝ وَ	قدم رہو ہم تم سے روزی نہیں مانگتے،

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى

(طٰہٰ - ۱۳۰ تا ۱۳۲)

ہم تم کو روزی دیں گے اور انجام کار
کی کامیابی تقویٰ کے لئے ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

(رعد - ۲۲)

اور جو اپنے رب کی رضا کی طلب
میں ثابت قدم رہے اور نماز
قائم کی۔

نیز فرمایا:۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ
بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ
اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ
اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ
اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ
اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ

پس ثابت قدم رہو، بیشک اللہ کا
وعدہ حق ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت
چاہو، اور صبح و شام اپنے رب کی حمد
کی تسبیح پڑھو۔ بیشک جو لوگ اللہ کی
آیات کے بارے میں، بغیر کسی دلیل کے
جو ان کے پاس آئی ہو۔ جھگڑتے ہیں
ان کے سینوں میں محض ایک گھمنڈ ہے
جو پورا نہ ہوگا، پس اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔

اَلسَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (غافر ۵۵-۵۶)   وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ کے عہد پر قائم رہنا، اس پر پورا بھروسہ کرنا، اس کی راہ میں مصائب جھیلنا اور عاقبت کار کی کامیابی کا منتظر رہنا کتنی کٹھن راہ ہے اور اس میں ہر قدم پر صبر و ثبات کی کتنی ضرورت ہے۔

یہی حال قربانی کا ہے۔ یہ اس عظیم الشان صبر کی تعلیم پر مبنی ہے، جو ابراہیم خلیل نے کیا تھا۔ بڑھاپے تک خدا نے ان کو کوئی اولاد نہیں بخشی لیکن جب بخشی اور ایسی اولاد بخشی جس کے حسن باطن اور حسن ظاہر نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا، تو اسی اولاد کو اپنی راہ میں قربان کرنے کا حکم دیدیا کتنا کٹھن امتحان تھا! لیکن حضرت ابراہیم کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی، بلکہ وہ خدا کے شکر گذار ہوئے کہ اس نے ان سے وہ چیز مانگی جو ان کو تمام دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز پر ہمارا صبر، اسی طرح کا صبر ہے جس طرح ہم مصیبت کے تحمل کے وقت کرتے ہیں۔ نماز اور خدا کی جانی و مالی آزمائشوں کے وقت صبر میں جو تعلق ہے اس کو آیت ذیل بے نقاب کردیتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا   اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ   مدد چاہو بے شک اللہ ثابت قدم رہنے

الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ
يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ
بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ
وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ
الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ
اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ
عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَرَحْمَةٌ ۝ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُهْتَدُوْنَ ۝ اِنَّ الصَّفَا
وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ؕ
فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ

والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ
کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ
نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم محسوس
نہیں کرتے۔ ہم تم کو کسی قدر خوف، بھوک
مال اور جانوں اور پھلوں کی کمی
سے آزمائیں گے۔ اور ثابت قدموں کو
بشارت دو۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب
ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں
ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف
لوٹنے والے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جن
پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں
اور رحمت ہے اور وہی لوگ راہ یاب
ہیں۔ بیشک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر
میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ کا حج
یا عمرہ کرے، کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کا

بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ — طواف کرے اور جس نے اپنی خوشی سے نیکی کی

اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (بقرہ-۱۵۳-۱۵۸) — تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت میں مروہ کا بھی تذکرہ ہے اور ہم اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، اب غور کرو! اس آیت میں نماز، صبر، حج، مناسک اور مقام قربانی کا تذکرہ ایک ساتھ ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اسلئے کہ ایک جامع حقیقت نے ان سب کا رشتہ ایک ساتھ جوڑ دیا ہے۔

۱۰۔ ان دونوں میں اس امر کا اقرار و اعتراف ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، اور تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں۔ نماز میں یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے۔ اس کی بنیاد ہی شکر اور اقرار ربوبیت پر ہے۔ غور کرنے سے یہی بات قربانی میں بھی معلوم ہوتی ہے، یہ بھی زبان حال سے گویا اسی حقیقت کا اظہار ہے، ہم قربانی کر کے گویا اقرار کرتے ہیں کہ: ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں، ہماری جانیں اور ہمارے مال سب اللہ کے خزانۂ جود و فیض سے ہم کو نصیب ہوئے ہیں، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو خدا کے حوالہ کریں اور اس کی طاعت و بندگی کی راہ میں ان کو استعمال کریں۔ یہ ہمکو اسی لئے بخشے گئے ہیں کہ ہم اسکے فضل و احسان کی شکر گذاری کریں اور جہاں اسکی مرضی ہو، وہاں ان کو قربان کر دیں، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے، اس لئے ہم صرف اسی کی بندگی کرتے ہیں اور اسکے حضور سجدے کرتے ہیں اور جو کچھ اس کا بخشا ہوا ہے، اسی کے دربار میں پیش کرتے ہیں، وہی پیدا کرنیوالا اور وہی بخشنے والا ہے۔ اس نے ہماری زبانوں پر

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا اقرار جاری کیا یعنی ہم اور ہماری تمام ملکیت خدا کے لئے ہیں۔ حکومت اور احسان صرف اسی کی صفت ہے ہمارے لئے صرف اطاعت اور شکر گذاری ہے۔ جس طرح ملکیت مالک کی طرف لوٹتی ہے، اسی طرح ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے کسی چیز سے یہاں تک کہ اپنے نفس سے متمتع ہونا بھی اس وقت تک جائز نہ ہوا جب تک ہم اس کا نام لے کر اس کی بخشش کا اقرار نہ کرلیں۔ اسی اصل عظیم کی تعلیم کے لئے اس نے ہمارے لئے قربانی کا فریضہ ٹھیرایا، کہ اس نے جو انعام و بہائم ہمارے لئے مسخر کئے ہیں۔ ہم ان کو اس کے نام پر قربان کریں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا	اور ہر امت کے لئے ہم نے قربانی قرار دی
مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى	تاکہ جو چوپائے ان کو روزی کئے ہیں،
مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (حج۔ ۳۴)	ان کو اللہ کے نام پر قربان کریں۔
كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ	اسی طرح خدا نے ان کو تمھارے لئے مسخر
عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔	کیا ہے تاکہ خدا نے تم کو جو ہدایت بخشی ہو
(حج۔ ۳۷)	اس پر اس کی بڑائی کرو۔

حیوانات پر انسان کو خدا نے جو اختیار و تصرف بخشا ہے۔ اس میں آقائی اور بندگی کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اسلئے ان کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا ضروری کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداوار میں بھی اس نے اپنا ایک حق رکھا تاکہ ہم یہ بات بھول نہ جائیں کہ یہ خدا کی بخشش سے ہم کو ملی ہے۔ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ۔ اور جب پھل آئے تو ان کا پھل کھاؤ اور کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔ چونکہ ہمارے قبضہ میں جو کچھ ہے وہ خدا کی ملکیت ہے، اس لئے اسراف ناجائز ہوا اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی ملکیت کی سب سے بڑی شہادت دی کہ اپنی جان اور اپنے محبوب لخت جگر کو اس کی راہ میں پیش کر دیا۔ اس لئے قربانی کے بیان کے لئے انہی کا بہترین نمونہ مثال قرار دیا گیا کہ خدا کی امانت خدا کے حوالہ کرنے کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں تھی۔

۱۱۔ یہ دونوں تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ نماز کی سب سے زیادہ نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے، جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کر رہا ہے۔ وہ دہنے بائیں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس لئے نماز نہ صرف ذریعہ تقرب بلکہ عین تقرب ہے۔ یہ آیت اس کی دلیل ہے۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، اور سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔ اسی لئے نماز راس العبادات قرار پائی۔ میرے خیال میں صلوٰۃ کا اصلی مفہوم قربت قریبہ کسی شے کی طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا ہے، اسی لئے گھوڑ دوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے

کے بعد ہو، مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو، اس کو صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس کے لئے بھی استعمال کیا جائے گا، جو آگ میں گھس جائے۔

بعینہ یہی حقیقت قربانی میں بھی مضمر ہے۔ قربانی کرنے والا اپنی قربانی ایسی جگہ لاتا ہے، جو اس کے خیال میں، خدا کی طرف سے اس عبادت کیلئے مخصوص اور مقدس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قربانی کیلئے ایک مخصوص و متعین جگہ قرار پائی۔ یہود کے یہاں بیت المقدس کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں لیکن مسلمانوں کیلئے جس طرح تمام زمین کو مسجد ہونے کا شرف حاصل ہوا، اسی طرح قربانی بھی ان کیلئے ہر جگہ جائز ہوئی تاہم جس طرح مسجد کی نماز کو فضیلت حاصل ہے اسی طرح قربان گاہ پر قربانی کرنا افضل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ متعین فرمائی تھی، اور یہی جگہ ہمارے لئے بھی مخصوص ہوئی چنانچہ جس طرح ہم ان کی مسجد کیلئے شد رحال کرتے ہیں، اسی طرح اپنے قربانی کے جانوروں کو بھی ان کی قربان گاہ پر لے جاتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد ہمارے دل میں یہ اعتقاد راسخ کرنا ہے کہ ہماری حیثیت غلاموں اور چاکروں کی ہے، جو لبیک کہتے ہوئے آقا کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں، اور اس کی خوشنودی اور اپنی بندگی کے اقرار کے لئے اپنی قربانیاں اس کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ پس جس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر صلوٰۃ کو صلوٰۃ کہا گیا، اسی حقیقت کی رعایت سے قربانی کے لئے قربانی کا لفظ

اختیار کیا گیا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے:۔

سمنوا ضحایاکم فانھا مطایاکم

اپنی قربانیوں کو فربہ کرو، کیونکہ وہ تمھاری سواریاں ہیں۔

اس میں بھی اس حقیقت کی جھلک موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اونٹ کی قربانی اس امت کے مخصوصات میں سے ہے۔ (دیکھو فصل ثانی)

۱۲۔ نماز اور قربانی عبادت کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ قدیم اور فطرت انسانی میں سب سے زیادہ راسخ ہیں۔ سجدہ، رکوع، اور نذر اظہار بندگی کے وہ ہر دلعزیز ذرایع ہیں، جو ہر قوم و ملت میں، عام اس سے کہ وہ ایک خدا کی پرستار رہی ہو یا متعدد دیوتاؤں کی، اس نے کسی روح یا بت کو پوجا ہو یا کسی انسان کو معبود بنایا ہو، عام رہی ہیں۔ بلا شبہ مہذب اور وحشی قوموں، برحق اور گمراہ جماعتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق ان کی نمازوں اور قربانیوں میں بھی بدرجہ اتم نمایاں رہتا ہے۔ تاہم نماز اور قربانی کی مقبول و محبوب عبادت کسی نہ کسی شکل میں خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہو، ہر جماعت میں پائی گئی ہے۔ جس طرح معبود کے ایک عام مفہوم میں باہم کم متفق ہونے کے باوجود خود معبود کے بارے میں ان کے آرا و معتقدات نے الگ الگ راہیں اختیار کر لیں، اسی طرح ان عبادتوں کے اشکال و صور بھی ہر ایک کے

یہاں مختلف سانچوں میں ڈھل گئے۔ لیکن ایک مشترک حقیقت پر اتفاق باقی رہا۔ باقی عبادات کے بارے میں تم کو یہ اتفاق رائے نظر نہیں آئے گا۔

پہلے سبب کی تفصیلات کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایمان و اسلام تمام کائنات کو محیط ہیں، اور نماز و قربانی انہی دونوں کی صورتیں ہیں۔ اب مذکورۂ بالا حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد تم پر یہ راز بھی کھل جائے گا کہ دین و عبادت کی راہ میں سب ایک ہی نقطے سے چلے تھے، لیکن اوہام و ظنون اور اغراض و اہواء نے خلط مبحث کر کے ان کو بے شمار راہوں پر ڈال دیا۔ پس یہ اختلاف جو آج نظر آرہا ہے، افراط و تفریط اور افساد و اختلاط کا نتیجہ ہے۔ حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔

تمام ملتوں پر ملتِ مسلمہ کی فضیلت

۱۱۔ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نماز کو جس طرح تمام عبادات پر فضیلت و تقدم حاصل ہے اسی طرح قربانی پر بھی اس کو فضیلت حاصل ہے۔ اسی لئے بیان میں خدا نے اس کو مقدم رکھا۔ ان دونوں کی باہمی مناسبت پر ہم نے جو تقریر کی ہے اس پر غور کرنے کے بعد اس فضیلت کی وجہ اور ان دونوں کی عظمت بالکل بے نقاب ہو جائے گی۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن

ایک اہم سوال باقی رہجاتا ہے۔ وہ یہ کہ کوثر کی عظیم الشان نعمت ہمارے لئے مخصوص کرنے اور نماز قربانی کے ایک ساتھ ذکر کرنے سے کیا خاص نتائج نکلتے ہیں؟ سو اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ ملتِ مسلمہ کو تمام دوسری ملتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

۲۔ یہود و نصاریٰ کے توبہ کی قبولیت، اسلام لانے پر منحصر ہے۔

۳۔ صرف مسلمان حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہیں۔

ان امور کے سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

تمام قدیم مذاہب میں خدا کے تقرب کا، سب سے بڑا ذریعہ قربانی تھا۔ یعنی ہمارے یہاں جو رتبہ نماز کو حاصل ہے، وہی رتبہ دوسرے مذاہب میں قربانی کو حاصل تھا۔ یہود کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ انھوں نے نماز کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، اور روزے کا ذکر بھی ان کے ہاں کنایات و اشارات کے حجاب میں گم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عقل حقیقی رشد و بلوغ کو نہیں پہنچی تھی اس لئے مجرد توجہ الی اللہ، جو نماز کی حقیقت ہے، ان کی روحانی تربیت کے لئے کفایت نہیں کرسکتی تھی۔ پس اس ملت میں نماز کو مقدم کرنا اور اس کو دین کا مغز قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ دین نے اپنی ترقی کا قدم، عروج و کمال کے آخری زینہ پر رکھدیا۔ لیکن یہ اہم نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئیے، کہ طبیعتوں کے مدارج فطرتاً

مختلف ہوتے ہیں۔ ایک قوم علم و حکمت کے ذروۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے، بایں ہمہ اس میں بہت سے ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو طفولیتِ عقلی کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے اگرچہ نماز کو عمادِ دین قرار دیا اور اپنے اصول میں اس کے لئے جو جگہ مخصوص کی وہ کسی عبادت کو نہ دی، تاہم قربانی کو بالکلیہ نہیں مٹایا۔ حتیٰ کہ اس نے ان قدماء کی یادگار بھی اپنے مراسم میں باقی رکھی جو دین کو محض رہبانیت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے کچھ آثار حج کے مراسم میں باقی ہیں۔

نصاریٰ کا حال مراسم میں بالکل یہود کے برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف نماز ہے۔ قربانی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن اس سے وہ ایک کامل مذہب پر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے، کیونکہ کمال اعتدال میں ہے۔ غلو سے کوئی بھلائی وجود میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ اسی غلو کا نتیجہ ہے کہ دین کی اصل بنیاد، ایمان کے باب میں وہ یہود سے بھی نیچے گر گئے۔ جس طرح اعمال کے باب میں یہود ان سے پست حالت میں تھے۔

اسی توسط و اعتدال کی رعایت اور ہر چیز کو اس کو اصلی جگہ دینے کے لئے قرآن میں سب سے زیادہ ذکر نماز کا آتا ہے اور "نحر" کا لفظ بجز اس سورہ کے

پورے قرآن میں کہیں نہیں آیا ہے۔ جن چند جگہوں پر "تفضیہ" کا ذکر آیا ہے، وہاں بھی تبعاً آیا ہے۔ پس چونکہ امت مسلمہ کے لئے نماز اور قربانی دونوں عبادتیں یکجا کی گئی ہیں اور خدا نے ان کے فلسفہ اور ان کی عظمت کو پوری طرح ہمارے لئے کھولا ہے، لہذا ہمارے پاس یہ کہنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ اس جامع شریعت، کو دوسری تمام شریعتوں اور ملتوں پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

مشرکین اور ملاحدہ کا ذکر نظر انداز کر دینا چاہئے۔ ان کی نماز و قربانی خدا کے لئے نہیں ہے، اس لئے وہ خارج از بحث ہیں۔ رہے یہود و نصاریٰ تو وہ صرف شریعت کے رکن اعظم ہی سے محروم نہیں ہیں بلکہ یک قلم دین ہی سے محروم ہیں، کیونکہ وہ ایک ایسے مذہب پر قانع ہو گئے جو ایک محدود مدت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نصاریٰ کا مذہب تجرد اور علٰحدگی کا مذہب تھا۔ اسمیں ہر شخص پر صرف اس کے نفس کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا تھا، اس لئے ان کو جہاد کا حکم نہیں دیا گیا صرف روزہ، نماز اور زکوۃ پر قائم رہنے کا حکم ہوا۔ اور ان عبادات کو بھی پوشیدہ طور پر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ طریقہ اگرچہ ان کی اصلاح و تربیت کے لئے نہایت موزوں تھا لیکن ان کے فرائض و سنن اس اختفا اور رازداری کے حجاب میں غائب ہو گئے، اور آہستہ آہستہ انھوں نے یہ تمام تعلیمات ضایع کر دیں۔ چنانچہ موجودہ اناجیل

روزہ اور نماز کا حکم بحیثیت فرائض کے نہیں دیتیں بلکہ ان کو صرف مستحبات کا درجہ دیتی ہیں اور سعی و تدبیر، کسب و محنت اور عوض و انعام کی بالکل مخالف ہیں۔ جب انھوں نے اپنی شریعت کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا (وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ) اس کی جگہ ان کی بدعات و خرافات نے لے لی۔ چنانچہ ان میں یہ اعتقاد پھیل گیا کہ چونکہ حضرت مسیحؑ اپنی تمام امت کی طرف سے قربان ہو گئے اس لئے قربانی کے حکم کی ذمہ داریوں سے وہ سبکدوش ہو گئے۔ اس خیال میں یہود کی شریعت کے اس حکم کی جھلک ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کسی گناہ کا کفارہ بغیر خون بہائے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنا خون بہا کر اپنی تمام امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس عقیدہ کے اختیار کر لینے کے بعد نصاریٰ کے لئے دو باتوں میں سے ایک کا ماننا لازمی ہو گیا۔ اور دونوں کفر و شناعت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ یا تو وہ یہ تسلیم کریں کہ حضرت مسیحؑ نے ان کے مستقبل کے تمام گناہوں کا بھی کفارہ ادا کر دیا۔ چنانچہ ان کے ایک فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لانا نجات کے لئے کافی ہے۔ اور یہ رجائیت کی بدترین صورت ہے۔ یا یہ مانیں کہ مستقبل کے گناہوں کی مغفرت کی کوئی صورت نہیں ہے، جیسا کہ ان کے ایک فرقہ اور ان کے امام پولوس کا خیال ہے۔ اور یہ معتزلہ کی اُس شناعت سے بدرجہا بڑھ کر ہے جس کے وہ رجائیت کی مخالفت

میں مرتکب ہوئے ہیں۔ یہی ابتری یہود کے ہاں بھی ہے۔ ان کے ہاں دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ بغیر قربانی کے مغفرت نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ ہیکل کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں۔ ان حکموں کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے ہیکل کے نکل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مذہب نے ان پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہی کہ اس نبی موعود (صلعم) پر ایمان لائیں جس کی بعثت سے ان کی تمام آرزوئیں وابستہ کی گئی تھیں۔ اور جس کو پوری طرح ان کے انبیا نے پہچنوا دیا تھا۔ قرآن مجید میں جس جگہ یہود کو آخری اور کامل شریعت کے ناقابل بتایا گیا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے ان کے لئے مغفرت چاہی ہے، وہاں اس وعدہ کا بھی ذکر ہے :-

قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ	کہا میں اپنا عذاب جس پر چاہتا ہوں
مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ	نازل کرتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز
کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ	کے لئے عام ہے پس میں اس کو ان لوگوں
یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ	کے لئے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ پر قائم
وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ	رہیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو
اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔ — جو اس رسول (نبی امی) کی پیروی کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ تین لفظوں کی ایک آیت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان پر بھاری ہے۔ اگر یہودیت و نصرانیت کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اس آیت کو دوسرے میں تو پہلے لفظ کے وزن سے، وہ یہودیت پر بھاری ہو جائے گی اور دوسرے لفظ کا وزن اس کو نصرانیت پر بھاری کر دے گا، اور چونکہ بقیہ تمام دنیا کی قربانیاں غیر اللہ کے لئے ہیں اور سب نے اللہ واحد کو چھوڑ کر ارباب و اصنام بنائے ہیں اس لئے بیچ کا عظیم الشان لفظ، اس کا پلہ تمام عالم سے گراں کر دے گا۔ پھر حسن نظم کا اعجاز دیکھئے کہ آپ سے آپ خدا پرستی کی کیسی سیدھی اور صاف راہ باز ہو گئی ہے! یعنی اللہ کی بندگی کی راہ یہ ہے کہ ہر حال میں خدا کی یاد کی جائے اور دل اس کی طرف متوجہ رہے۔ اور زمانہ اور حالت کی رعایت کے ساتھ ہر موزوں شکل میں اس کے سامنے عجز و نیاز کی نذر گزرانی جائے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی وراثت نبی امی صلعم اور ان کے اتباع کی طرف منتقل کر دی اور اس مخصوص وراثت

سے یہود و نصاریٰ کو محروم کر دیا۔ اس لئے اُس نماز اور قربانی کا حکم دیا جو اس اُمت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ظاہر و منصوص ہے حضرت ابراہیمؑ نے ایک مسجد کی تعمیر کی تھی، کوئی قربان گاہ نہیں بنائی تھی۔

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ — میرے گھر کو طواف کرنے والوں،

وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ — اعتکاف کرنے والوں اور رکوع

السُّجُوْدِ۔ — و سجدہ کرنیوالوں کے لئے پاک رکھو۔

یعنی نماز ہی میں ان کے دین کی غایت اور اصل اساس پوشیدہ تھی۔ باقی رہی قربانی، تو یہ ان کی اور ان کے اطاعت شعار فرزند۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ کی فدویتِ جان سپاری کی یادگار ہے۔ اس لئے اس سنت کے قیام و احیاء کے لئے مقام مروہ مخصوص ہوا، جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی جگہ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے حجاج بیت اللہ کی میزبانی کی یادگار بنا کر اس کو ہمیشہ کے لئے قائم و ثابت کر دیا۔

یہود کی عبادت تمام تر قربانی میں محصور تھی اور یہ بھی ان تمام حقائق و اشارات، سے یکسر خالی جن کی طرف قرآنِ حکیم نے جا بجا رہنمائی کی ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایک شہادت بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ ان کی یہ قربانی حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے۔ اُن کی آسمانی کتاب خود ان کی اس

دعویٰ کی بہمہ وجوہ تردید کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم مفصل اس کے مقام پر لکھ چکے ہیں۔

چونکہ صورت معاملہ یہ تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر "نحر" کا لفظ استعمال کیا جو اونٹ کے ذبح کے لئے مخصوص ہے اور اونٹ یہود پر حرام تھا۔ اس بحث کی تفصیلات سورۂ بقرہ اور آل عمران سے متعلق ہیں، یہاں اجمالی اشارہ کافی ہے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہئے کہ اونٹ کی قربانی میں یہود کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ قربانی صرف ابراہیمی قربانی ہے، جو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے لئے مخصوص ہے۔

شَانِئَكَ اور الاَبتَر کی تاویل

۱۲- آخری آیت کی تاویل سے پہلے اس کے دو لفظوں "شَانِئَكَ" اور "الاَبتَر" پر غور کر لینا چاہئے۔

لفظ "شانیٔ"، معرفہ کی طرف مضاف ہو کر خود تعریف کے حکم میں آگیا ہے۔ لیکن معرفہ کے لئے تعیین وتشخص لازمی نہیں، تاہم بعض مفسرین نے تعیین کرنی چاہی اور چونکہ ان کا مبدا استنباط عام احوال و واقعات ہیں، اس لئے جیسا کہ اس حالت میں متوقع ہے، ان کے اقوال مختلف ہو گئے۔ ابن عباسؓ سعید بن جبیرؓ

مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عاصم بن وائل ہے، جس نے کہا تھا "انا شانی محمدؐ"۔ میں محمدؐ کا دشمن ہوں۔ شمر بن عطیہ سے روایت ہے کہ یہ عقبہ بن معیط ہے وہ یہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبرؐ کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہے گی۔ ان کی نسل منقطع ہے۔ اسی طرح ابن عباسؓ اور عکرمہؓ کے بعض اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے قریشؐ مراد لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اگرچہ اس لفظ کا مصداق کوئی مخصوص شخص ہونا چاہئے اور آیت کا اولین محمل وہی ہوگا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لیکر اس کی فضیحت نہیں پسند کی تو بہتر یہی ہے کہ ہم بھی تسمیہ و تعئین سے احتراز کریں۔

یہ تفصیلات اس صورت سے متعلق ہیں جب کسی معین شخص کو مراد لیا جائے لیکن، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں، معرفہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ مامون راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ اس کا نظم و سیاق جس طرف اشارہ کرے اسی طرف چلنا چاہئے۔ پچھلی سورہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ رجحان کلام قریش کی طرف ہے، تمام قابل اعتماد روایات اسی کی تائید کرتی ہیں۔ پھر حالات و قرائن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس لفظ کے سب سے زیادہ صحیح مصداق ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پچھلے مباحث کا اقتضا بھی یہی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اولاً اور بالذات اس سے قریش کو مراد لینا چاہئے۔ پھر ہر اس جماعت یا شخص کو جس میں یہ صفت پائی جائے۔ موقع نزول

کی خصوصیات کسی لفظ کی وسعتوں کو محدود نہیں کرتیں۔ یہاں اس لفظ کے متعلق اتنی گفتگو کافی ہے۔ آیت کی تفسیر کے ذیل میں مزید تفصیل ملے گی۔

"ابتر" بتر سے صفت کا صیغہ ہے۔ "بتر" کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ یہ لفظ مختلف طریقوں سے استعمال ہوا ہے، جن پر غور کرنے سے اس معنی کی طرف رہبری ہوتی ہے جو یہاں مراد ہے۔ اس لئے اس مادہ کے مشتقات ہم ان کی معنوی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

سیف باتر، یا بتار، شمشیر براں کو کہتے ہیں۔ بتر فلان رحمه، فلاں شخص نے رشتہ رحم کو کاٹ دیا۔ اسی سے اباتر، ہے، جس کے معنی قاطع رحم کے ہیں۔ ابتر الرجل کے معنی ہیں دیا پھر رک گیا۔ حجة بتراء برہان قاطع کو کہتے ہیں۔ قربانی والی حدیث میں ہے۔ انه نهی عن المبتورة۔ آپ نے دُم بریدہ جانور کی قربانی سے منع فرمایا۔ ابتر، ایک خاص سانپ کو کہتے ہیں جس کی دم چھوٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح ابتر، اس شخص کو کہتے ہیں جس کی نسل منقطع ہو۔ حدیث میں ہے، کل امر ذی بال لم یبدأ ببسم اللہ فھو ابتر، جو اہم کام اللہ کے نام سے نہ شروع کیا جائے وہ ابتر ہے۔ جو خطبہ حمد و صلوۃ سے خالی ہو اس کو بتراء کہتے ہیں۔ بتراء اس مشک ... کو بھی کہتے ہیں جس میں لٹکانے کی رسی یا تسمہ نہ ہو۔

"ابتران" گدھے اور غلام کے لئے بولا جاتا ہے۔ سورج کی تمازت اور اس کی شعاعوں کی تابانی جب ماند پڑ جاتی ہے تو اس کو "بتیراء" کہتے ہیں۔

ان تمام مشتقات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ابتر" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ان تمام چیزوں سے محروم ہو گیا ہو، جو ایک شخص کی عزت و عظمت اور قوت و شوکت کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ دیکھو، سورج جب اپنی شعاعوں کی فوج سے الگ ہو کر، اپنے تمام جلال و عظمت سے محروم ہو جاتا ہے اور ایک چھوٹی سی ٹکیا کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے تو اس کو "بتیراء" کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اپنے رشتۂ رحم کو کاٹ کر، اعوان و انصار کی حمایت سے محروم ہو جاتا ہے، اس کو ابتر کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے "ابتران" کا لفظ گدھے اور غلام کے لئے بولا گیا کہ قبیلہ میں سب سے زیادہ کم حمایتی انہی کے ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر قتادہؓ نے "ابتر" کے معنی "حقیر و ذلیل" کے بتائے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ مقطوع کے معنی سے چلکر صغیر و قصیر کے معنی میں آیا۔ پھر بے یار و مددگار اور حقیر و ذلیل کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ان دونوں لفظوں کی تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد ہم آیت کی تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی تاویل

۱۳۔ اس میں شبہہ نہیں ہے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ان لوگوں کے جواب میں ہے، جنھوں نے آنحضرت صلعم کو بطریق طعن ابتر کہا تھا۔ تمام مفسرین نے ایسا ہی سمجھا ہے۔ ہم کو بھی اس سے پورا اتفاق ہے۔ لیکن اس کہنے سے ان کا مطلب کیا تھا؟ اس کا جواب کسی قدر محتاج تفصیل ہے۔

جب آنحضرت صلعم نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے خیال کیا کہ آپ نے رشتۂ رحم کاٹ کر، ایک طرف عرب کے معزز ترین خاندان کی تمام عظمتوں سے اپنے کو محروم کر لیا اور دوسری طرف تولیتِ کعبہ اور اس کی ہمجواری کی جو عزت و سعادت اس خاندان کے واسطے سے، آپ کو حاصل تھی، وہ بھی اپنے ہاتھوں برباد کر دی۔ اس کے بعد آپ کی حیثیت ان کی نظر میں محض ایک شاخ بریدہ کی تھی جو اپنے تنہ سے الگ ہو کر خشک اور فنا ہو جانے کے لئے چھوڑ دی گئی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو برکت و کثرت اور فتح و نصرت کی بشارت دی کہ آپ کے دشمنوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ خود وہی بے یار و مددگار اور تباہ و برباد ہوں گے؛ اور چونکہ یہ بات ان کے خیال کی تردید میں کہی گئی ہے اس لئے اس میں ایک لطیف تعریض بھی ہے کہ آپ کے اعدا جس عزت پر آج فخر کر رہے

ہیں وہ عنقریب ان سے چھن جائے گی۔ اس پہلو سے اس آیت میں فتح مکہ کی بشارت ہے۔

لعنت اور نظم کلام کے علاوہ روایات سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے۔ امام سیوطیؒ کہتے ہیں:۔

"بزاز وغیرہ نے بسند صحیح ابن عباس سے تخریج کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ کعب بن اشرف مکہ آیا قریش نے اس سے کہا، تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ اس شخص کو دیکھتے ہو، جو اپنی قوم سے کٹ کر علحدہ ہوگیا ہے۔ اور پھر بھی اپنے تئیں ہم سے افضل خیال کرتا ہے! حالانکہ حجاج کے نگران ان کو پانی پلانے والے اور خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی ہم ہیں۔ کعب نے جواب دیا تم اس سے افضل ہو۔ اس پر "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" والی آیت اتری"۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں تخریج کی ہے کہ "ابن المنذر عکرمہ سے راوی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے مشرف فرمایا۔ قریش نے کہا کہ محمد ہم سے کٹ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اِنَّ شَانِئَكَ الخ والی آیت نازل فرمائی"۔

امام احمدؒ وغیرہ نے اسی مضمون کی روایتیں تخریج کی ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔

بعینہ اسی مضمون کی ایک روایت ابن جریر نے تخریج کی ہے جو ابن عباس سے مروی ہے کہ جب کعب بن اشرف مکہ آیا تو قریش اس سے ملے اور کہا کہ ہم حجاج کو پانی پلاتے ہیں اور کعبہ کے کلید بردار ہیں۔ تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ بتاؤ ہم بہتر ہیں یا یہ شخص جو اپنی قوم سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ہے اور اپنے کو ہم سے افضل خیال کرتا ہے۔ اس نے کہا تم افضل ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اِنَّ شَانِئَكَ الخ والی آیت نازل فرمائی اور اسی موقع پر یہ آیت بھی نازل ہوئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا	کیا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جن کو کتاب
مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ	آسمانی کا ایک حصہ ملا ہے وہ جبت
وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ	وطاغوت پر ایمان لاتے ہیں اور کفار
كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ	سے کہتے ہیں کہ تم لوگ مسلمانوں سے
اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	زیادہ راہ یاب ہو۔ یہی لوگ ہیں جن
لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ	پر خدا کی پھٹکار ہے اور جن پر خدا کی پھٹکار
فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝	ہوئی تم ان کیلئے کوئی مددگار نہیں پاسکتے۔"

بعینہ اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت عکرمہؓ سے بھی ہے مگر ونحن اهل السقاية

وعندنا منحر البدن، کے الفاظ اس میں زیادہ ہیں

یہ تمام روایتیں، تقریباً ہم معنی ہیں۔ قریش کو اپنے خاندانی شرف واصالت نیز بیت اللہ کی ہمجواری وخدمت اور قربانی پر بڑا ناز تھا۔ وہ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت سمجھتے تھے، اس لئے ان کو خیال ہوا کہ جو شخص ان سے علٰحدہ ہوگیا وہ اس شاخ بریدہ کے مانند ہے جس کا خشک ہو کر فنا ہو جانا یقینی ہے۔ وہ اپنے اس گمان میں مگن تھے اور یہودی سردار کی تائید نے اس کو مزید قوت دیدی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کردی کہ جو خیال تم پیغمبر عالم (صلعم) کے متعلق قائم کر رہے ہو، وہ بالکل غلط ہے۔ البتہ تم عنقریب مخذول ومقہور ہوگے۔ اور وہ تمام نعمتیں جو تم کو خانہ کعبہ کی تولیت کے صلہ میں ملی تھیں، تمہاری شرارتوں اور بدعہدیوں کی پاداش میں، تم سے چھین لی جائیں گی۔ چنانچہ سورہ براۃ کے نزول نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو سچ کر دیا اور خانۂ کعبہ سے مشرکین کا رشتہ یک قلم منقطع کر دیا گیا۔ یہاں یہ مجمل اشارات کافی ہیں۔ پندرہویں فصل میں اس کے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی۔

سورہ کا موقع نزول اور فتح مکہ کی بشارت

۱۴۔ پچھلی فصلوں میں گذر چکا ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کی بشارت ہے اور "اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ" میں ماضی کا صیغہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ وعدۂ فتح عنقریب پورا

ہونے والا ہے۔

قرآنِ مجید کی ایک سے زیادہ آیات میں، اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم کو صبر و انتظار کا حکم دیا ہے۔ اور فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن ہر آیت میں ایک قسم کا ابہام ہے۔ مثلاً

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ۔

ہم ان کو جس چیز کی دھمکی دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو تم کو دکھا دیں گے یا دکھانے سے پہلے تم کو اٹھا لیں۔ تمہارے اوپر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے حساب کا تعلق ہم سے ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ

یا تو ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ہم ان سے انتقام لیں گے یا تمہیں دکھائیں گے وہ چیز جس کی ہم نے ان کو دھمکی دی ہے۔ کیونکہ ہم کو ان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے،

ان آیتوں سے صاف نہیں کھلتا تھا کہ آنحضرت صلعم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ ہوگا؟ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح نصرتِ الٰہی کے ظہور سے پہلے اٹھا لئے جائیں گے یا حضرت نوح علیہ السلام

کی طرح غلبہ و نصرت ربانی کا جلال دیکھ کر، یا ان دونوں سے الگ آپ کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا سا معاملہ پیش آئے گا۔ جن کو فتح و نصرت کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں میں دکھا دیا گیا۔ لیکن اس کے کامل ظہور کا وعدہ آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا۔ اس وجہ سے مسلمان ایک صاف و صریح وعدہ کے لئے بے قرار تھے۔ اس آیت نے نازل ہو کر، مسلمانوں کو فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی، اور جو بات اب تک اخفاء و ابہام کے حجاب میں گم تھی، بے نقاب ہو کر سامنے آگئی۔

اس لئے قیاس یہ ہے کہ یا تو یہ سورہ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا پہلی فتح یعنی صلح حدیبیہ کے روز نازل ہوئی ہے۔ روایات سے بھی ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں مندرجہ ذیل روایت نقل کی ہے۔

"سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کر کے لوٹ جاؤ۔ آنحضرت اٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی اور قربانی کی، اسی وقت حضرت جبرئیلؑ نے "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" کا پیام دیا۔"

امام سیوطیؒ نے یہ حدیث نقل کر کے لکھا کہ "اس میں سخت غرابت ہے۔" لیکن اس

غرابت کی کوئی وجہ نہیں بیان کی ہے۔ چونکہ یہ روایت مختلف وجوہ سے، مشہور خیال کے مخالف نظر آئی۔ اس لئے انھوں نے وجہ غرابت کی تشریح ضروری نہیں سمجھی۔ حالانکہ جن اسباب سے ان کو یہ وہم ہوا، وہ غور و تامل کے بعد، بالکل بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔

ہم اجمالاً ان کو یہاں بیان کر دیتے ہیں تاکہ ان کے ضعف کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) انھوں نے خیال کیا کہ یہ سورہ مکی ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے بعد پیش آیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ علما نے تصریح کر دی ہے کہ جو سورتیں ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئی ہیں، وہ بھی مکی کہلاتی ہیں۔ حدیبیہ مکہ سے بالکل قریب ہے دونوں کے درمیان صرف ایک منزل کی مسافت ہے۔ اور حدیبیہ اور مدینہ کے درمیان نو منزلوں کی مسافت ہے۔ حدیبیہ حرم میں داخل ہے۔

(۲) دوسرا شبہ یہ ہوا کہ حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے ۵ سال ۸ مہینے کے بعد پیش آیا اور کعب بن اشرف، ہجرت کے تیسرے سال قتل ہوا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ"، اس کے اُس سوال کے جواب پر نازل ہوئی ہے جو قریش نے اس سے پوچھا تھا اور جس کی تفصیل پچھلی فصل میں گذر چکی ہے۔ اس لئے اس سورہ کا حدیبیہ کے موقع پر اترنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جب کسی آیت کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے موقع پر اتری تو اس کا مطلب کوئی متعین و مخصوص

وقت نہیں ہوتا، بلکہ ایک خاص حالت کے ساتھ آیت کی مطابقت ظاہر کرنی مقصود ہوتی ہے۔ اس لئے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ سے وہ تمام جماعتیں مراد ہوں گی جو آنحضرت صلعم کی دشمن ہوں، خواہ وہ فنا ہو چکی ہوں، یا قیامت تک ظاہر ہوتی رہیں۔ اس آیت کے نزول کے وقت تک آپ کے جو اعداء ذلت و نامرادی کی موت مر چکے تھے وہ گویا سب باقی رہ جانے والے دشمنوں کے لئے مثال و عبرت تھے۔ کعب سے گفتگو کرنے کے بعد یہ نہیں ہوا تھا کہ قریش نے آنحضرت صلعم کے بارہ میں اپنا فیصلہ بدل دیا ہو بلکہ اس شریر نے جو کچھ ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا وہی ان کا اذعان و اعتقاد تھا۔ لیکن جب نصرت الٰہیہ کے ظہور نے آپ کے تمام اعداء کو پامال کر ڈالا تو مجبوراً ان کو اپنا یقین بدلنا پڑا۔ پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قریش کے متعلق ہے، جو کعب کے فریب میں آگئے تھے، ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ آیت ان کے حال سے بالکل مطابق ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے طعنہ کا جواب دیا اور ذرا بھی توقف نہیں فرمایا۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس آیت میں "شانئ" سے عقبہ بن معیط کو مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اس نے آنحضرت صلعم کو طعنہ دیا تھا کہ آپ کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی، اس لئے آپ 'ابتر' ہیں۔ عقبہ بدر میں قید ہوا اور بدر کے جو قیدی قتل ہوئے ان کے ساتھ قتل کیا گیا۔ لیکن یہ وجہ بھی کوئی قوی وجہ نہیں ہے۔ دوسری

وجہ کی تردید میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی تردید کے لئے بھی کافی ہے۔ پھر اس آیت کی صحیح تاویل اس طعن سے بالکل بے تعلق ہے' ابتر' سے یہاں منقطع النسل یالا ولد مراد نہیں ہے۔ یہ تاویل بالکل سخیف ہے۔ نظم بھی اس سے ابا کرتا ہے اور روایت کی طرف سے بھی اسمیں ضعف ہے۔ اس لئے سعید بن جبیر کے قول میں کوئی غرابت نہیں ہے بلکہ حق بات یہی ہے۔

اس سورہ کی اوپر والی دو آیتوں کی تفسیر میں محمدؐ بن کعب قرظی سے جو قول مروی ہے اس سے بھی سعید بن جبیر کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"بہت سے لوگ غیراللہ کے لئے عبادت و قربانی کرتے تھے پس اے محمدؐ جب ہم تم کو کوثر بخشیں تو تمھاری نماز و قربانی صرف ہمارے لئے ہونی چاہئیے"

وہ گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قریش کوثر کی عظیم الشان نعمت پاکر بھی محروم ہی رہے کیونکہ انھوں نے اس نعمت کی قدر نہیں پہچانی اور اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے یہ نعمت ان سے چھین کر تم کو بخشی۔ پس جب ہم اس کو تمھیں دیدیں، اور گویا دے چکے تو تم اس کا حق ادا کرو۔

یہ مسلم ہے کہ جب کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دیا جائے جو کسی واقع ہونے والی بات پر متفرع ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بات یا تو واقع ہو چکی ہے یا عنقریب واقع ہونے والی ہے۔ چنانچہ جب سورہ نصر اتری تو لوگوں نے اس کے مضمون سے یہی سمجھا کہ اس کا

نزول ظہور نسخ وغلبہ اسلام کے وقت ہوا ہے اسی طرح ہم نے بھی محمد بن کعب کے قول "جب ہم تم کو کوثر بخشیں" کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہم نے تم کو بخش دیا اور اس وعدہ کے ظہور کا وقت قریب آگیا ہے۔

سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر

۵:۔ جو تاویل ہم نے اوپر بیان کی ہے، اگر تم اس کو صحیح تسلیم کر کے اس سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالو گے اور ان آیات کے تمام حدود و اطراف پر غور کرو گے تو تمھارے سامنے چند اہم حقیقتیں آئیں گی۔

۱۔ آنحضرت صلعم وراثت ابراہیمی کے وارث ہیں اور آپ کی بعثت دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا ظہور و اعلان ہے۔

۲۔ یہ عطیہ اللہ تعالیٰ نے خائنوں اور ناشکروں سے چھین لیا کیونکہ ایسے لوگ خدا کے یہاں مبغوض ہیں۔ جیسا کہ سورہ حج میں بیان فرما دیا ہے۔

۳۔ اس عطیہ سے محرومی ایک مخصوص صفت کا نتیجہ قرار دی گئی ہے، جس سے اسکی اصل علت بھی واضح ہوگئی یعنی پیغمبر سے دشمنی خدا کی برکتوں سے محرومی کا سبب ہے۔

۴۔ یہ محرومی و نامرادی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لئے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو

لوگ وراثتِ ابراہیمی کے وارث ہیں وہ اس کے دوست ہوں گے۔ یعنی یہ وراثت اہلِ حق اور اصحابِ باطل کے درمیان ایک نشانِ امتیاز ہے۔ جو اس سے محروم ہوں گے ان کا شمار دشمنوں میں ہوگا اور جو اس سے سرفراز ہوں گے ان کا شمار دوستوں میں ہوگا۔

۵۔ جب نماز اور قربانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دوستی اور محبت کا نشان قرار دیا ہے تو لازماً ان کا ترک اس کی دشمنی کی دلیل ہوگا۔ اور مشرکین، اور یہود و نصاریٰ اور اس امت کے تمام متبعین اس کے اعداء کے حکم میں داخل ہوں گے۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے نماز کا استخفاف کیا ہے اور بعض نے حج کا اور بعض دونوں ہی سے دست بردار ہوگئے ہیں۔ پس جو لوگ نماز، قربانی اور حج کو ضایع کردیں گے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہوں گے اور یہود و نصاریٰ کی طرح وراثت ابراہیمیؑ سے محروم اور ذلیل و پامال ہوں گے۔ لیکن اسلام پر اللہ تعالیٰ کا مخصوص فضل و کرم ہے کہ اہلِ حق و اصحابِ سنت کی ایک جماعت اس کی حمایت کے لئے باقی ہے جو انشاءاللہ فروغ پائے گی۔ اور اسلام کی عزت و شوکت کا ذریعہ ہوگی۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ — اگر تم منہ موڑ لوگے۔ اللہ تعالیٰ تمھاری جگہ دوسری قوم کھڑی کریگا۔ پھر وہ تمھاری طرح نہ ہوگی۔

ان تفصیلات سے واضح ہوگیا کہ یہ سورہ ایک طرف فتح مکہ کی بشارت ہے

دوسری طرف اس میں آنحضرت صلعم کے دشمنوں کے لئے وراثت ابراہیمی سے محرومی کی تہدید و وعید ہے۔ اس کا اول و آخر بالکل مقابلہ کے اسلوب پر ہے اور بیچ کا حصہ گویا برزخ کی طرح دونوں طرف متعلق ہے۔ یعنی جو لوگ توحید پر قائم رہ کر نماز اور قربانی کو قائم کریں گے وہ کوثر کی نعمت سے سرفراز ہوں گے۔ اور جو ان کو ترک کریں گے، وہ کوثر سے محروم ہوں گے۔ اس سورہ کی مثال ایک ترازو کی ہے، جسمیں دو پلڑے ہیں اور بیچ میں اس کی زبان ہے۔ ایک پلڑے میں خیر کثیر کی گراں مایہ دولت ہے دوسرے میں محرومی و نامرادی کی ذلت۔ یا یوں سمجھو کہ ایک طرف وجود ہے اور دوسری طرف عدم اور جس طرح میزان کی زبان وزن کی طرف جھکتی ہے، اسی طرح بیچ کی آیت، پہلی آیت کی طرف جھکتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان "ف" کے ذریعہ ربط قائم کیا گیا ہے۔ برعکس اسکے تیسری آیت بالکل علیحدہ ہے۔ گویا سورہ کا اسلوب ہی اعلان کر رہا ہے کہ حوض کوثر، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور جاں نثاروں کا مخصوص حصہ ہے۔ آپ کے اعداء اور مخالفین اس نعمت گرانمایہ سے محروم ہوں گے۔

امتِ محمدؐ صلعم کیلئے رضوانِ الٰہی کی بشارت

۱۶- اوپر گذر چکا ہے کہ جس طرح یہ محرومی آپ کے تمام دشمنوں کے لئے عام ہے

اسی طرح یہ بخشش آپ کے لئے اور آپ کی امت کے لئے عام ہے۔ اس لئے یہ بشارت کفر پر اسلام کے غلبہ ہی کی بشارت نہیں ہے، بلکہ قیامت کے دن آپ کی امت پر رحمت و رضوان الٰہی کی جو بارش ہوگی اس کی بشارت بھی اس میں مضمر ہے اور آخرت میں حوض کوثر کا بخشنا اسی حقیقت کی ایک تعبیر ہے۔

اس سورہ میں جو پیشین گوئی مضمر تھی۔ اس کے واقع ہو جانے کے بعد گویا اس امر کا اعلان ہو گیا کہ مسلمان خدا کے ایمان و تصدیق کی کسوٹی پر پورے اترے اور خدا نے ان سے راضی ہو کر، ان کو قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے چن لیا۔ انبیاء کے حالات اور قرآن کی تصریحات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے، کہ نبوت کا آغاز مصائب اور صبر کے ماحول میں ہوتا ہے اور اس کی انتہا برکات اور اجر پر ہوتی ہے۔ اس لئے مکہ کی فتح نے اعلان کر دیا کہ مسلمان خانہ کعبہ کے متولی اور خدا کی زمین میں دینِ حق کے گواہ ہیں۔ یہ گویا اس وعدہ کا ظہور ہے جو فرمایا گیا تھا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو تم میں سے ایمان لائے اور نیکوکار ہوئے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ جس طرح ان سے
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	پہلے کے لوگوں کو اس نے خلافت دی تھی اسی
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ	طرح ان کو بھی زمین میں خلافت دیگا

لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	اور اُن کیلئے اُس دین کو محکم کرے گا جسے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	اس نے ان کیلئے پسندیدہ ٹھیرایا ہے
اَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ	اور ان کی خوف کی حالت کو امن و اطمینان
بِيْ شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ	سے بدل دے گا۔ وہ لوگ صرف میری
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔	بندگی کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک
	نہ ٹھیرائیں گے۔ اور ان انعامات کے بعد
	جس کسی نے کفر کیا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

یہی وہ وعدہ تھا جس کو "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" کہکر پورا کر دیا۔ ان دونوں آیتوں میں خاص طرح کا تشابہ ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ نماز قائم کرو اور زکوۃ دو، جو "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" سے ملتی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا۔ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ رسول کی اطاعت کرو کہ تم پر خدا رحم فرمائے۔ یہ آیت جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ سے مشابہ ہے۔

بالکل یہی حال سورہ فتح کا ہے۔ اللہ تعالی نے امت مرحومہ کیلئے امن و رحمت اور رضوان و مغفرت، نیز ارض مقدس پر غلبہ کے جو وعدے فرمائے تھے، یہ سورہ تمام ترانہی وعدوں کی تکمیل و ظہور کی بشارت ہے۔ انبیاء کے صحیفوں اور خصوصاً زبور اور امثال

میں بھی یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآنِ مجید کی بعض آیات میں اسکی طرف اشارہ ہے مثلاً۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ	اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے
بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ	کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے
يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ	ہوں گے۔

یہاں زمین سے مراد وہ "ارض مقدس ہے جو ارض جنت کی مثال ہے اور آل عمران اور سورۂ فیل کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ شرف و تقدم کی جو مزیت مکہ معظمہ کو حاصل ہے وہ اس آسمان کے نیچے زمین کے کسی ٹکڑے کو حاصل نہیں ہے۔ پس سورۂ کوثر کے نزول کے وقت وعدۂ وراثت کا ظہور شروع ہو چکا تھا یہاں تک کہ وہ پورا ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس "زمین" کفار کے ہاتھوں سے چھین کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں دیدی اور اس طرح گویا اعلان کر دیا کہ اللہ کے نیک بندے اور اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مصداق وہی ہیں اس لئے زمین کی خلافت و حکومت کے مستحق ہوئے۔

اس وعدہ کے ظہور نے آنحضرت صلعم کے متعلق اس بشارت کی بھی تصدیق کر دی جو حضرت موسیٰؑ نے دی تھی کہ جب نبی موعود آئے گا تو ارض مقدس کو کفار کے غلبہ استیلاء سے پاک کرے گا۔ بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء و سلاطین آئے ان میں سے کسی کے

عہد میں بھی اس پیشین گوئی کی تصدیق نہیں ہوئی۔ ان کے تمام صحیفے اس دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس لئے یہود ایک ایسے پیغمبر کے منتظر تھے جو ارض مقدس کو کفار کے استیلا سے پاک کرے۔ قرآن مجید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ	اور جب ان کے پاس، اللہ کے پاس سے
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا	ایک کتاب آئی جو ان کی کتابوں کی
مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ	تصدیق کرتی تھی اور حال یہ تھا کہ
يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ	وہ پہلے سے کافروں پر فتح کے طلبگار تھے
كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا	تو جب وہ چیز ان کے پاس آگئی جس کو
عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ	وہ پہچانتے تھے انھوں نے اس کا انکار کردیا۔

نبوّتِ محمدیؐ کی ایک دائمی دلیل

۱۷۔ یہ سورہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ "کوثر" سے محرومی کی علت پیغمبر صلعم کی عداوت ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک متصل اور دائمی واقعہ کی خبر ہے۔

یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے، کہ وہ کسی خاص سرزمین کے متعلق یہ

اعلان کردے کہ اس پر اس کی سلطنت ہمیشہ قائم رہیگی اور اس کے اعدا اس سرزمین سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ زمانہ کے سیل حوادث کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ بڑی بڑی بادشاہتیں اور بڑے بڑے سلاطین اسکے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ لیکن قرآن نے سورۂ کوثر میں جو اعلان کیا، اس کو زمانہ آجتک باطل نہ کر سکا۔ اس لئے یہ عظیم الشان پیشین گوئی ایک طرف مسلمانوں کے لئے ایک لازوال بشارت ہے۔ دوسری طرف اس میں خاتم النبیین کی نبوت کی ایک دائمی اور غیر فانی حجت ہے اور یہ غیبیانہ پیشین گوئی ان پیشین گوئیوں سے کہیں بڑھکر ہے، جن کی عمریں ختم ہو چکیں۔ مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کی وہ پیشین گوئیاں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔

وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ — اور تمھیں پہلے سے بتا دوں گا جو تم کھاؤ گے

وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ — اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں جمع کرو گے۔

یا دانیال اور حزقیل نبی کی پیشین گوئیاں جن کے ظہور کا ابتک انتظار ہے۔ آنحضرت صلعم کی بعثت ہمیشہ کے لئے تھی۔ اس لئے چند روزہ پیشین گوئیاں آپ کی شانِ رسالت سے فروتر تھیں۔ آپ آخری نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آپکے ظہور سے بہت سی اگلی پیشین گوئیوں کی تصدیق فرمائی دوسری طرف آپکو ہمیشہ باقی رہنے والی حجتوں سے سرفراز فرمایا۔

پھر پیشین گوئی کا کمال اعجاز یہ ہے کہ وہ ظاہری حالات کے بالکل خلاف ہو۔ اس پیشینگوئی میں یہ شان، کمال درجہ موجود ہے۔ یہ سورہ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے، صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جس میں بظاہر غلبہ کفار کو حاصل ہوا تھا۔ صلح کی تمام شرطیں تقریباً ان کے موافق تھیں یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے علانیہ اس سے اختلاف کیا اور آنحضرت صلعم کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ معاہدہ کے بعض الفاظ کو کفار کے اصرار و اختلاف سے آنحضرت صلعم نے مٹانے کا حکم دیا تو بعض صحابہؓ نے اسکی تعمیل سے انکار کر دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس روز کے ظاہری حالات اس قسم کی پیشین گوئی کے بالکل خلاف تھے۔ یہ پیشین گوئی بالکل اسی قسم کی تھی جیسی آپ نے رومیوں کے غلبہ کے بارہ میں فرمائی تھی۔ وہ بھی جیسا کہ ہم بہ تفصیل لکھ چکے ہیں، ظاہری حالات کے بالکل خلاف تھی۔

حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس نبوت کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے از انجملہ یہ بھی ہے کہ اس کی پیشینگوئیاں جلد تر پوری ہوں گی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کو دیکھ کر اس کے حق ہونے کا یقین کریں گے۔

تثنیہ ۱۸ میں ہے

میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اسکے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا۔ وہ سب ان سے

کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی باتوں کو، جنھیں وہ میرا نام لیکے کہیگا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا۔ اور معبودوں کے نام لیکر کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیوں کر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں؟ تو جان رکھو کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے اس سے مت ڈر۔"

یوحنا باب ۱۶ میں ہے۔

"لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئیگا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائیگا اسلئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبر دے گا۔"

چنانچہ اس سورہ کے نزول کے کچھ ہی دنوں بعد مکہ فتح ہوا۔ اور مسلمانوں کیلئے یہ پیشین گوئی ایک لازوال بشارت اور کفار کیلئے ایک دائمی انذار و وعید کی شکل میں پوری ہو گئی۔ ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھکر، غور کرو اس میں آنحضرت صلعم کی رسالت کی صداقت کی کیسی اہم حجتیں مضمر ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کا وعدہ اور اُس کی تصدیق

۱۸۔ پچھلی فصلوں میں جو مباحث گذرے ہیں ان سے یہ حقیقت بالکل روشن ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلعم اور آپ کے اتباع کو خیر کثیر کی دولت بخشی اور آپ کے اعدا کو اس سے محروم فرمایا۔ یہ بعینہٖ اس وعدہ کی تکمیل ہے جو خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا کہ تمام اہلِ زمین ان کی ذریت سے برکت پائیں گے۔ اور جو ان پر برکت بھیجے گا وہ مبارک ہوگا۔ اور جو لعنت بھیجے گا وہ ملعون ہوگا۔ یہ دونوں باتیں اس سورہ میں موجود ہیں۔ پہلی بات "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" میں موجود ہے۔ اور دوسری بات "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" میں۔ دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلعم میں ایک نمایاں مشابہت نظر آئے گی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت مقتضی ہوئی کہ تمام برکات کا سرچشمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنائے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے بعد تمام آسمانی برکتوں کے وارث وہی ہوئے جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا — اللہ ... آدم، نوح اور آلِ ابراہیم

وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ — اور آلِ عمران کو تمام عالم پر

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ برگزیدہ کیا۔

"آل عمران" بھی ذریت ابراہیمؑ میں شامل ہیں۔ اس لئے خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے لئے گویا تمام عالم میں صرف آل ابراہیمؑ کا انتخاب ہوا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے واسطے سے تمام اہل زمین کو برکت دینے کا وعدہ کیا گیا۔

تکوین میں باب ۱۲ میں ہے۔

"اور خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور قرابتوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھلاؤں گا، نکل چل۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤنگا۔ اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا۔ اور تو ایک برکت ہوگا۔ اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں، برکت دوں گا اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے، لعنتی کروں گا۔ اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔"

یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مروہ کی طرف ہجرت فرمائی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی جگہ ہے۔ اس لئے اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عام برکت کا وعدہ ان کی ذریت کے واسطے سے پورا ہوگا۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اس کی صاف تصریح فرمادی۔

تکوین باب ۲۲ میں ہے۔

"خداوند فرماتا ہے اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا.......... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی"

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اس برکت کا اصلی سبب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی ہے۔ ہر چند کہ یہ برکت اسحٰق علیہ السلام کی ذریت سے بھی پھیلی لیکن اس کا اصلی سرچشمہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی کی ذریت ہے۔ ایک دوسرے مقام پر اس کے متعلق ایک اہم حقیقت بیان ہوئی ہے۔

"ابرہام تو یقیناً ایک بڑی اور بزرگ قوم ہوگا۔ اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں گی کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کرکے عدل اور انصاف کریں گے۔ تاکہ خداوند ابرہام کے واسطے سے جو کچھ اس نے اس کے حق میں کہا ہے پورا کرے" تکوین باب ۱۸

یہاں برکت سے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابرا

علیہ السلام سے فرمایا تھا۔ نیز اس سے ایک نئی حقیقت آشکارا ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو دین دیا گیا تھا اس کی حقیقت نیکی اور عدل تھی۔ اب غور کرو کہ آنحضرت صلعم کے ظہور سے یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ آپ کی بعثت اس سرزمین میں ہوئی جو ان تمام برکات کا سرچشمہ تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سرزمین اور دینِ ابراہیمی کا وارث بنایا، آپ کی شریعت کی بنیاد نیکی اور عدل پر ہے۔ آپ کی بعثت سے تمام روئے زمین کے لئے عام برکت کا وعدہ پورا ہوا۔ کیونکہ آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً	ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کیلئے
لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا	بشیر و نذیر بنا کر۔
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً	اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام عالم
لِّلْعٰلَمِيْنَ۔	کے لئے رحمت بنا کر۔

چونکہ آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے عام ہے اس لئے وہ برکت بھی جو آپ کے ذریعہ دنیا میں پھیلی۔ آپ کے تمام پیرووں کے لئے جو آپ کی ذات اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات پر برکت بھیجتے ہیں عام ہوگی۔ یہ اس وعدہ کی تصدیق ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا کہ

"جو تجھے برکت دیتا ہے میں اسے برکت دوں گا۔"

اس کو دوسرے لفظوں میں زیادہ وضاحت سے یوں سمجھو کہ برکت کے معنی ہیں اہل وعیال کی کثرت کی دعا دینا۔ اس لئے اگر کوئی شخص، کسی شخص کو برکت کی دعا دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسکے اہل وعیال کو بھی خیر و برکت کی دعا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب ہم آنحضرت صلعم پر برکت بھیجتے ہیں تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر برکت بھیجتے ہیں۔ علی ہذا القیاس جب ہم آنحضرت صلعم پر درود بھیجتے ہیں تو گویا آپ کی ذریت اور آل پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ اسی لئے نمازوں میں ہم یوں دعا کرتے ہیں۔

"اللھم صل علی محمد وعلیٰ ال محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلےٰ ال ابراھیم"

یعنی تو نے جس طرح ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ پر رحمت نازل فرمائی اسی طرح محمدؐ اور آل محمدؐ پر بھی اپنی برکت و رحمت نازل فرما تاکہ تیرا وعدہ پورا ہو۔ یہ برکت بھیجنے کا حکم دوسری امتوں کو نہیں دیا گیا۔ صرف مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ — اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر رحمت بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی اس پر

اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ — درود و سلام بھیجو۔

اسی لئے ہم اپنی تمام نمازوں کو درود پر ختم کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ اولاً تو نماز کی فرضیت کے قائل نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ یا ان کی ذریت میں سے کسی پر درود نہیں بھیجتے۔ یہ درود صرف آنحضرت کی امت کا شعار ہے۔ ہم تشہد میں پہلے خدا کی بارگاہ میں "صلوات و طیبات" کی نذر گذرانتے ہیں پھر اس کے تمام صالح بندوں کے لئے اس کی رحمت و برکت مانگتے ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلعم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام لیتے ہیں تاکہ ان کے حقوق کا اعتراف کریں۔ یہ گویا اس نیکی اور عدل کی ایک فرع ہے جو نزول برکات کا سبب ہے۔

اس شریعت کی برکت عمومی کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ اس میں ہمکو تمام دنیا کے ساتھ عدل اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدل سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے بارہ میں لڑائی نہیں کی۔ اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں

اِلَیۡھِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ	نکالا ہے۔ اللہ عدل کرنیوالوں کو
الۡمُقۡسِطِیۡنَ ۝	دوست رکھتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	اے ایمان لانیوالو! اللہ کیلئے مستعد
کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ	بنے رہو انصاف کے ساتھ شہادت
شُھَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا	دینے والے۔ اور کسی قوم کی عداوت
یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ	تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرنے کہ تم عدل کو
عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا	چھوڑ بیٹھو۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ
ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی	سے اقرب ہے۔

اس شریعت کے جزئیات احکام بھی جیسا کہ اس کے محل میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ عمومیت اور مساوات کی اس روح سے معمور ہیں۔ اور یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے کہ خانہ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے احسان اور عدل کا مرکز بنایا ہے۔ کیونکہ اس کا سنگِ بنیاد توحید ہے۔ اور اس کی تعمیر ذکر و شکر اور ہمدردی خلق کے لئے ہوئی ہے۔ اور قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ توحید راس العدل ہے۔ کیونکہ اس نے شرک کو "ظلم عظیم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے۔

اور پچھلے مباحث میں یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ نماز اور قربانی جن کا اس سورہ میں ذکر ہے در حقیقت خانۂ کعبہ کے بنیادی مقاصد یعنی توحید، ذکر و شکر اور مواسات کے قیام و تحفظ کے لئے ہیں۔ یعنی بالواسطہ یہ تمام چیزیں بر و عدل کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ چونکہ خانہ کعبہ ہی تعلیم احسان عدل کا مرکز ہے اس لئے تمام برکات کا سرچشمہ بھی وہی ہوگا۔

یہ تمام باتیں اشارہ کر رہی ہیں کہ اس سورہ میں "کوثر" سے مراد "خانۂ کعبہ" ہی ہے۔

اس سورہ کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں۔ جن کو لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی عبادہ الصالحین۔

سلسلۂ دائرہ حمیدیہ نمبر ۶

تفسیر سورۂ فیل

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبدالاحد اصلاحی

اصلاح پریس سرائمیر میں چھپی

۱۳۵۶ھ

فہرستِ مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (۱) کیا نہیں دیکھا تو نے کہ تیرے خداوند نے
بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ؕ ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ (۲) کیا کھو نہ دی ان کی چال۔
فِيْ تَضْلِيْلٍ ۙ . . . .
وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا (۳) اور بھیجے ان پر چڑے فوج در فوج۔
اَبَابِيْلَ ۙ . . . .
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ (۴) تو پھینکتا تھا ان پر پتھر۔
سِجِّيْلٍ ۙ . . . .
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (۵) آخر انھیں ایسا کر دیا جیسا کھانے کا بھس

الفاظ کی شرح

۱۔ اس سورہ میں کوئی غریب لفظ نہیں ہے لیکن ہم تمام اہم الفاظ کی

شرح کر دیتے ہیں تاکہ ان کے اطراف و جوانب اور امور متعلقہ نظر کے سامنے آجائیں۔

۱۔ "اَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ" سے مراد ابرہہ اشرم کی فوج ہے۔ اس کا پورا قصہ فصل (۶-۱۰) میں آئے گا۔

۲۔ "فیل" واحد ہے۔ لیکن چونکہ اس کی طرف جمع کی اضافت ہے اس لئے یہاں اس سے صنف کا مفہوم سمجھا جائے گا۔ یہ استعمال بہت عام ہے۔ مثلاً اصحب الرأی، اصحب الحدیث وغیرہ، قرآن مجید میں ہے۔

ذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَۃِ (مزمل۔ ۱۱) مجھ کو اور ان خوش حال جھٹلانے والوں کو چھوڑ دے۔

اس لئے یہاں یہ لفظ وحدت و کثرت دونوں کا محتمل ہے۔ روایات سے دونوں کی تائید ہوتی ہے، لیکن کثرت کا مفہوم زیادہ لگتا ہوا ہے۔

۳۔ "کید" اس مخفی تدبیر کو کہتے ہیں جو مخالف کی ضرر رسانی کے لئے کی جائے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّہُمۡ یَکِیۡدُوۡنَ کَیۡدًا وَّ اَکِیۡدُ کَیۡدًا (طارق ۱۵:۱۶) وہ بھی چھپے ہوئے داؤ کر رہے ہیں اور میں بھی چھپے ہوئے داؤ کر رہا ہوں۔

فرعون کے قصہ میں ہے۔

فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى (طٰہٰ۔ ۶۰)

پھر وہ اپنی تمام تدبیریں اکٹھی کر کے آیا۔

دوسری جگہ ہے۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا (طٰہٰ۔ ۶۴)

تم اپنی تمام تدبیریں اکٹھی کر لو پھر متحد ہو کر آؤ۔

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا (آل عمران۔ ۱۲۰)

ان کی مخفی تدبیریں تمھیں ذرا بھی گزند نہ پہنچا سکیں گی۔

نابغہ کہتا ہے۔

یقودھم النعمان منہ بمحصف — وکید یغم الخارجی مناجل

نعمان ایسی محکم رائے اور ٹھوس تدبیر سے ان کی قیادت کرتا تھا جو زور آور حریفوں کو بھی زیر کر لے۔

زہیر بن ابی سلمی بادشاہ سنان کی مدح میں کہتا ہے۔

لہ لقب لباغی الخیر سھل — وکید حین تبلوہ متین

طالب خیر کیلئے اس کا نام لطف و کرم ہے۔ اور اگر تم اس کو آزماؤ تو اس کی تدبیر نہایت

محکم پاؤ گے۔

"کید متین" یعنی ٹھوس تدبیر

وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ — میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں بیشک

مَتِیْنٌ (القلم - ۴۵، الاعراف ۱۸۳) — میری تدبیر نہایت محکم ہے۔

اسی طرح "کید" کی بابت ضعف و وہن کی بھی نسبت کیجاتی ہے۔ مثلاً

وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ — بے شک اللہ کافروں کی تدبیر کو

الْكٰفِرِيْنَ (الانفال - ۱) — کمزور کرے گا۔

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ — بیشک شیطان کی تدبیر نہایت

ضَعِيْفًا (النساء - ۷۶) — پھُس پھُسی ہوتی ہے۔

بعض جگہ اسکے لئے "ضلال" (کھو جانا) "تباب" (ڈھ جانا) اور "عدم ہدایت" (راہ یاب نہ ہونا) کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تفصیلات آگے آتی ہیں۔

۴۔ "تضلیل" اضلال کا مبالغہ ہے۔ مصدر یہاں صیغۂ مجہول کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہاتھی والوں کی تدبیر اکارت گئی۔ اسی وجہ سے "کید" کے لئے "ضلال" (کھو جانا) اور عدم ہدایت کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ — اور اللہ تعالیٰ بدعہدوں کی تدبیر کو

الْخَائِنِيْنَ (یوسف۔ ۵۲) بامراد نہیں کرتا۔

...ب بن زہیر کہتے ہیں

ان الامانی والاحلام تضلیل

آرزوئیں اور تمنائیں سب اکارت ہیں

شعر "فی تضلیل" کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے جو داؤ چلایا وہ بالکل غلط پڑا۔ یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر ہوئی ہے۔

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا اور فرعون کی ساری چالیں

فِي تَبَابٍ (غافر۔ ۳۷) بیکار ہی گئیں۔

"لفظ" "تباب" نے واقعہ کی تصویر کھینچدی، یعنی ساری تدبیریں اکارت گئیں، ایک تیر بھی نشانہ پر نہیں لگا۔ یہی حقیقت زیادہ واضح لفظوں میں یوں بیان ہوئی ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کافروں کے اعمال کی مثال یہ ہے

اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ کہ راکھ کا ڈھیر ہو جس پر آندھی والے

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ دن میں تند ہوا چلے اور سب اڑا

لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا لے جائے۔ ان کی کمائی میں سے

كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ   ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا یہی

هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ   حقیقی محرومی ہے۔

(ابراہیم۔ ۱۸)

۶۔ "ارسل علیھم" علیٰ میں یہاں استیلاء اور ضرر دونوں کا مفہوم پنہاں ہے۔ مثلاً

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا   اور ہم نے ان پر تیز و تند آندھی

صَرْصَرًا (القمر۔ ۱۹)   مسلط کر دی۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ   ہم نے شیطانوں کو کافروں پر

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (مریم۔ ۸۳)   چھوڑ دیا۔

عام بول چال میں کہتے ہیں۔ ارسل الکلب علی الصید کتے کو شکار پر چھوڑ دیا۔

۷۔ "الطیر" اکثروں کے نزدیک رکب وصحب، کی طرح اسم جمع ہے، لیکن میرے نزدیک اسم صنف ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کی زبانی منقول ہے۔

اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ   میں تمہارے لئے چڑیا کی شکل کی

كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيْهِ	میں تمھارے لئے چڑیا کی شکل کی
فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ	ایک مورت بناؤں گا پھر اس میں
(آل عمران - ۴۹)	پھونک ماروں گا اور اللہ کے حکم سے زندہ
	چڑیا بن جائے گی۔

جب اس سے مراد جمع ہو گی تو اس کا اطلاق ان گنت پر ہو گا اور بمقابلہ جمع کے کثرت پر اس کی دلالت زیادہ قوی ہو گی۔ مثلاً

وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (ص - ۱۹)	اور چڑیاں جھنڈ کی جھنڈ۔
أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ	وہ اپنے اوپر فضا میں چڑیوں کے
صَفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا	جھنڈ نہیں دیکھتے؟ جو قطار در قطار
يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ (الملک ۱۹)	پروں کو پھیلائے ہوئے اڑ رہی ہیں
. . . .	اور کبھی پروں کو سمیٹ لیتی ہیں۔ وہاں
. . . .	ان کو خدائے رحمٰن ہی تھامے ہوئے ہے

۸ :- "ابابیل"، جمع ہے۔ اس کی واحد نہیں ہے۔ بعضوں نے اس کو ابالۃ کی جمع بتایا ہے۔ عموماً یہ لفظ گھوڑوں کی جماعت اور چڑیوں وغیرہ کے جھنڈ کے لئے بولا جاتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا شعر ہے۔

وبالفوارس من ورقاء قد علموا فرسان صدق على جرد اباییل

اور ورقاء کے اپنے شہسواروں کے ساتھ جو اصیل غول در غول گھوڑوں پر سوار تھے اور جن کی شجاعت مسلم تھی۔

اعشیٰ کا شعر ہے۔

طریق وجبار رواء اصوله علیه ابابیل من الطیر تنعب

کھجوروں کے چھوٹے اور بڑے درخت جن کی جڑیں سیراب تھیں اور جن پر کوؤں کے غول چیخ رہے تھے۔

۹۔ "الحجارۃ" لوگوں نے اس کو حجر کی جمع بتایا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ اسم صنف ہے۔ قرآنِ مجید میں مشرکین کی زبانی منقول ہے۔

وَإِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ	اور یاد کرو جب انھوں نے کہا۔
هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ	اے رب اگر یہی بات تیرے ہاں سے
فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً	سچ ہو تو ہم پر آسمان سے
مِّنَ السَّمَاءِ (الانفال ۳۲)	پتھر برسا۔
قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ	کہہ دو سنگ یا آہن بن جاؤ یا
حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِّمَّا	کوئی اور مخلوق جو تمھاری نظر

يَكْبُرُ فِي صُدُوْرِكُمْ   میں ان سے بھی زیادہ سخت

(الاسراء - ۵۰-۵۱)   ہو۔

اعشیٰ کا شعر ہے۔

وحوادث الايام لا   يبقى لها الا الحجارة

حوادث روزگار کے مقابلہ میں صرف پتھر ہی باقی رہ سکتے ہیں

۱۰۔ "سجیل"، دو فارسی لفظوں سنگ (پتھر) اور گل (مٹی) سے معرب ہے۔ لوط علیہ السلام کے قصہ میں جہاں یہ لفظ وارد ہے۔ قرآن مجید نے دو طریقوں سے اس کی شرح کی ہے۔ ایک جگہ ہے (وامطر علینا حجارۃ من سجیل) سجیل کے قسم کے کنکر دوسری جگہ ہے (حجارۃ من طین) چونکہ یہ لفظ لغت عرب میں شامل ہو چکا تھا، اس لئے قرآن نے اس کو استعمال کیا۔ اس سورہ میں بوجہ مناسبت قافیہ طین کی جگہ "سجیل"، رکھا۔

۱۱۔ "کعصف ماکول"، عصف، جو، گیہوں وغیرہ کے پتوں اور خشک ریزہ ریزہ ڈنٹھلوں کو کہتے ہیں، ماکول، وہ شے جو کھائی جائے۔ کسی شے کا نام اس کی غایت کے اعتبار سے رکھنا عربی زبان کا عام اسلوب ہے یہاں وہی اسلوب ملحوظ ہے۔ مثلاً

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۝ (الانفال-۴۲) تاکہ اللہ اس کام کو کر دے جو کرنی کا تھا۔

"اصحاب فیل،، کو "عصف ماکول،، سے اس لئے تشبیہ دی کہ اس جنگ میں ان کو ایسی شکست ہوئی کہ ان کی تمام طاقت پارہ پارہ ہوگئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کی حکومت کی بھی دھجیاں اڑگئیں۔ یہ تشبیہ عربی زبان میں مستعمل ہے۔ عدی بن زید اپنے مشہور قصیدہ میں کہتا ہے۔

ثم صاروا کانھم ورق جف فالوت بہ الصبا والدبور

پھر وہ خشک پتیوں کے مانند ہوگئے۔ جن کو پروا اور پچھوا ہوا اڑائے لئے پھرتی ہے

قرآن مجید میں ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (الکہف-۴۵)

اور ان کے لئے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کر دو کہ جیسے آسمان سے ہم نے پانی اتارا اور زمین کی نباتات اس سے سیراب ہو کر خوب اگیں پھر وہ خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہوگئیں جنکو ہوائیں اِدھر اُدھر اڑائے لئے پھرتی ہیں۔

پرانے صحیفوں میں بھی یہ تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ ہوسیع باب ۱۳، آیۃ ۳ میں ہے۔

"اس لئے وہ صبح کے ابر کے مانند ہوں گے اور اس اوس کے مانند جو سویرے جاتی رہتی ہے اور بھوسی کی طرح جو بگولے کے ساتھ کھلیان پر سے اڑائی جاتی ہے اور اس دھوئیں کے مانند ہوں گے جو دود کش سے نکلا چلا جاتا ہے۔"

اس تاریخی حقیقت سے اس تشبیہ کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے کہ ابرہہ کے آدمیوں کے اعضا میدان میں بکھرے ہوئے پڑے تھے اور چڑیاں ان کو نوچ نوچ کر کھاتی تھیں۔ تفصیلات آگے آتی ہیں۔

اس سورہ میں مخاطب کون ہے؟

۲۔ عمود اور نظم پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سورہ کے مخاطب کو متعین کر لیا جائے، تاکہ صحیح تاویل، صحیح نظم اور سیاق و محل کے محاسن تک پہنچنے کی راہ باز ہو سکے۔

ہمارے نزدیک اس سورہ کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس قصہ

کا مشاہدہ کیا تھا یا بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے۔ یہ زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے۔ گویا واحد کا لفظ ایک ایک کر کے پوری جماعت کو مخاطب کرتا ہے۔ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ توراۃ میں جہاں کہیں خدا نے بنی اسرائیل کو واحد کے صیغہ سے خطاب کیا ہے، وہاں یہی اسلوب ملحوظ ہے۔ مفصل بحث کتاب الاسالیب میں ملے گی۔ یہاں ہم صرف قرآن مجید سے بعض مثالیں نقل کریں گے۔ فرمایا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي	نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں
فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ	چلتی ہیں اللہ کے فضل سے تاکہ
لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ	تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ
(لقمان۔ ۳۱)	کرائے۔

اس آیت میں کلام، واحد کے صیغہ (الم تر) سے شروع ہوا لیکن پھر (لیریکم) میں جمع کی ضمیر آگئی کیونکہ واحد سے مقصود درحقیقت جمع ہی تھی۔

دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	نہیں دیکھتے کہ خدا نے آسمانوں اور
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ یَّشَاْ	زمین کو ایک غایت کے ساتھ پیدا کیا
یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ	ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے
جَدِیْدٍ ۝ (ابراہیم۔ ۱۹)	اور تمہاری جگہ نئی مخلوق بسائے۔

اس آیت میں بھی وہی اصول ملحوظ ہے۔ کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے۔ لیکن اس سے مقصود وہی جمع ہوتی ہے۔ مثلاً

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا	اے ایمان والو "راعنا" مت کہو
رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا	بلکہ "انظرنا" کہو۔

(البقرہ۔ ۱۰۴)

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ	کیا نہیں جانتے کہ بیشک اللہ ہر چیز
شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ	پر قدرت رکھتا ہے کیا نہیں جانتے
اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ	کہ اللہ ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کی
الْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ	بادشاہی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا

دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا — کوئی یار و ناصر نہیں ہے۔

نَصِیْرٍ ۝ (البقرہ۔ ۱۰۶/ ۱۰۷) . . . .

دیکھو خطاب جمع کے صیغہ (لاتقولوا) سے شروع ہوا، پھر واحد (الم تعلم) کا صیغہ آگیا اور اس کے بعد (ومالکم) میں جمع کی ضمیر آگئی۔

ایک جگہ ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ — میں تمھیں بتاؤں شیاطین کن

الشَّیٰطِیْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ — پر اترتے ہیں؟ وہ لپاٹیوں اور

اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ۝ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ — گنہگاروں پر اترتے ہیں۔ وہ کان

وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ وَالشُّعَرَآءُ — لگاتے ہیں حالانکہ اکثر جھوٹے

یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ — ہوتے ہیں اور شعرا کی پیروی تو

تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ — گمراہ لوگ کرتے ہیں نہیں دیکھتے

یَّهِیْمُوْنَ ۝ (الشعراء۔ ۲۲۱-۲۲۵) — کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں

کلام شروع ہوا (انبئکم) ضمیر خطاب جمع سے، پھر (الم تر) واحد کا صیغہ آگیا۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى — اگر تم انھیں ہدایت کیلئے بلاؤ گے

لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰاهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف - ۱۹۸)

نہیں سنیں گے، تم خیال کرتے ہو کہ وہ تمہاری طرف تاک رہے ہیں، حالانکہ ان کو کچھ نہیں سوجھتا۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۲۱-۴۰) میں واحد سے جمع اور جمع سے واحد کی طرف انتقال کی ایک سے زیادہ مثالیں موجود ہیں اور ایسے قرائن کے ساتھ کہ کسی طرح پیغمبر صلعم کی طرف خطاب کا گمان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آیت ذیل بھی اسی سلسلہ میں وارد ہے، جس کے بعد اس قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا

تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اسکے سوا کسی کی پوجا نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بوڑھے ہو جائیں تو ان کو بار سمجھ کر اُف نہ کہنا اور نہ کسی بات پر جھڑکنا بلکہ شریف بیٹے کی طرح دلجوئی کی

تُكَلِّمُهُمَا (الاسراء-٢٣) باتیں کرنا۔

ممکن ہے تم کو تردد ہو، یہ بات اپنی جگہ پر ٹھیک سہی، لیکن جب مشہور یہی ہے کہ اس سورہ میں روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور یہاں کوئی چیز اس سے مانع نہیں تو ایک مشہور بات چھوڑ کر اس کا مخاطب ایک جماعت کو کیوں سمجھا جائے؟ اس کے لئے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

ا۔ "الم تر"، کا استعمال زیادہ تر عام خطاب کے لئے ہے۔ بغیر کسی قرینہ کے اس کو خاص خطاب کے مفہوم میں لینا اس کے عام استعمال کے خلاف ہے۔ یہاں واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ جن لوگوں نے واقعہ کا مشاہدہ کیا ہو انہی کو مخاطب مانا جائے۔ اوپر جو مثالیں گذر چکی ہیں ان سے صاف ثابت ہے کہ عربی میں واحد حاضر کا صیغہ جمع کے لئے عام طور پر استعمال ہے۔ ہم نے بقصد اختصار صرف چند مثالیں ذکر کی ہیں، ورنہ اس کے شواہد بیشمار ہیں۔ ممکن ہے کسی کو خیال ہو، چونکہ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے اس لئے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو ابتدائے کلام میں خطاب پیغمبر ہی سے ہونا چاہئے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآنِ مجید جس طرح سلسلۂ کلام میں عام لوگوں کو

مخاطب کرتا ہے، اسی طرح ابتدائے کلام میں بھی عام خطاب سے دعوت دیتا ہے مثلاً "الھکم التکاثر"، تم تفاخر دولت میں بھولے رہے۔ "یا ایھا الناس" اے لوگو! (اس خطاب سے دو سورتیں شروع ہوئی ہیں) اسی طرح سلسلۂ کلام میں "فبای اٰلاء ربك تتمارى"، اور "فبای اٰلاء ربکما تکذبان" والی آیتیں وارد ہیں۔ خصوصاً موخر الذکر بار بار دہرائی گئی ہے۔ اور اگر حسن تاویل کو نگاہ میں رکھا جائے تو بہت سی آیتوں میں، جہاں لوگوں نے آنحضرت صلعم کو مخاطب مانا ہے، عام خطاب ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً "فما یکذبك بعد بالدین"، سو اب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے۔ "وما ادرٰك ما القارعة"، اور تونے اس ٹھوکنے والی کو کیا سمجھا؟ "وما ادرٰك ما ھیة"، اور تونے کیا سمجھا ہے کہ وہ کیا ہے؟ الغرض جب قرآن نے عام انسانوں یا مخاطب جماعت کو حسب موقع واحد، جمع، مثنی کے صیغوں سے اکثر مخاطب کیا ہے تو تعیین خطاب میں اصول کی حیثیت سے حسن تاویل ہی کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سورہ کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ اللہ مکہ اور اہل مکہ کی، ان کے دشمنوں کے مقابل میں، حمایت کرتا ہے اور استفہام یہاں

جیسا کہ ظاہر ہے، زجر و تنبیہ کے لئے ہے۔ اس لئے اس کا خطاب ایسے ہی لوگوں کی طرف ہو سکتا ہے جنھوں نے زیر سوال واقعہ کے نتائج و عواقب پیش نظر رکھنے میں تغافل کیا ہو۔ گویا ان کو ایک سمجھی بوجھی ہوئی حقیقت سے اغماض پر تنبیہ کی گئی ہے کہ تم آگاہ ہونے کے باوجود اس قسم کی غفلت کے مرتکب کیوں ہوتے ہو؟ اس فصل میں اوپر جو آیتیں مذکور ہوئی ہیں ان میں الم تر، اور الم تعلم، وغیرہ میں زجر و تنبیہ کا پہلو بالکل نمایاں ہے۔ پھر ایسی صورت میں روئے خطاب پیغمبر صلعم کی طرف کیوں کر ہو سکتا ہے، جبکہ سورہ میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کا نہیں ہے کہ آپ سے اس معاملہ میں کوئی چوک ہوئی ہو جس پر تنبیہ کی ضرورت ہو؟ البتہ اہل مکہ کی طرف خطاب ہو سکتا ہے۔ وہ اولاً تو بت پرستی کرتے تھے۔ ثانیاً مسلمانوں کو نماز سے روکتے تھے جو کفران نعمت الٰہی کا سب سے زیادہ بدنما مظاہرہ ہے۔ چنانچہ بعد کی سورہ میں حقیقت بالکل بے نقاب ہو گئی ہے۔ اس کے مضمون کو ملا لو تو گویا بات یوں ہو گی کہ تم اس گھر کے رب کی پوجا کیوں نہیں کرتے اور شرک و بت پرستی چھوڑ کر صرف اس ایک پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے جس نے تم کو تمھارے دشمنوں سے مامون کیا اور ہر موقع پر مدد فرمائی؟

۳۔ اگر مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے تو لازماً اس میں تسلی کا مفہوم لینا ہوگا کہ جس طرح خدا نے اس گھر کے پہلے دشمنوں کو شکست دی اسی طرح ان موجودہ دشمنوں یعنی مشرکین کو بھی برباد کرے گا۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ روئے خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید لوگوں کو سنانے کے لیے اتارا گیا ہے۔ "وقرآنا فرقناہ لتقراہ علی الناس علی مکث"، اس لئے جب آنحضرت صلعم اس کو قریش کو سناتے تو وہ اس سے حجت پکڑتے کہ اگر یہ بات ہے تو ہم خدا کی مدد و نصرت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ہم خانہ کعبہ کے متولی ہیں اور سورہ سے خود ثابت ہے کہ خدا نے ہمارے دشمنوں کے مقابل میں ہماری مدد فرمائی اور ان کو پامال کیا۔ اس لئے تہدید کا پہلو اختیار کرنے میں آیت کی تاویل بہتر نہیں ہوگی۔ بہتر تاویل اسی صورت میں ہوگی کہ اس کو تحریض کے مفہوم میں لیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات یاد دلا کر انھیں اتباع توحید پر ابھارا ہے۔ بعد والی سورہ میں اس کی تصریح ہے، اس لئے لازماً مخاطب انھی کو ماننا پڑے گا۔

۴۔ مابعد سورہ کا ربط بھی اسی کا مقتضی ہے کہ مخاطب قریش کو مانا جائے۔ اگلی فصل میں اس کی تفصیل آئے گی۔ بہرحال گذشتہ تصریحات سے یہ بات

واضح ہوگئی کہ اس سورہ میں مخاطب آنحضرت صلعم نہیں بلکہ قریش ہیں اور واحد کے صیغہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ قریش کے ایک ایک فرد کو مخاطب کر کے اس کی ذمہ داری یاد دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گذار رہے، اس کو ہر وقت یاد رکھے، اور جس طرح بندہ اپنے منعم حقیقی سے ڈرتا ہے اسی طرح ڈرے اور اس کی بندگی کرے۔ مابعد سورہ میں اس کی پوری تصریح ہے۔ ان وجوہ سے ضروری ہے کہ "ربک" میں ضمیر خطاب کا مخاطب انہی کو سمجھا جائے۔

سورہ کا عمود اور ماقبل و مابعد سے تعلق

۳۔ سابق سورہ میں، ایک عیب جو اور اشارہ باز کا ذکر ہے، جو انجام سے غافل اور مال و جاہ کی لذتوں میں سرمست ہے۔ اس کو خبر دی گئی ہے کہ وہ تباہ ہوگا اور اپنے تمام سامان عیش کے ساتھ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ اور چور چور کر دینے والی جہنم میں پڑے گا۔ اس سورہ میں بطور ایک تاریخی شہادت کے ان لوگوں کی تباہی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو قوت کے گھمنڈ اور دولت کے نشہ میں، اللہ کے مقدس گھر پر چڑھ دوڑے اور اس کے قہر و غضب کی پروا نہ کی حالانکہ اس عظیم الشان گھر کی عظمت سے، اپنے مذہبی صحیفوں کے ذریعہ

اچھی طرح واقف تھے۔ یہود کی دشمنی میں انھوں نے اسی طرح کی جسارت مسجد یروشلم کے ساتھ بھی کی تھی اور یہود نے بھی جوش عناد سے اندھے ہو کر اسی طرح کی گستاخیاں کی تھیں۔ یہاں ان تفصیلات میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔

خدا نے اس مغرور دولت مند کو یہ تاریخی واقعہ یاد دلایا ہے جس کا ایک قرشی ہونے کی وجہ سے وہ ایک عینی شاہد بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہوگا کیونکہ اس کی اور اسکے پیرؤوں کی بدعات ہی نے بیت اللہ کی حرمت برباد کی۔ اس کے کفر و فسق اور طماعیوں کی تفصیلات تفسیر سورۃ اللھب میں گذر چکی ہیں۔ اس کو مخاطب کر کے گویا خداوند تعالیٰ نے یاد دلایا ہے کہ دیکھ! تیرے جیسے شریروں اور مغروروں کے سر خدا نے کس طرح کچلے! انکی ساری قوت کس طرح پاڑ پاڑ کر ڈالی! یہ مقدس گھر جو قریش کی عظمت اور ان کے امن و رزق کا ضامن ہے، ان کی نجاستوں سے پاک کیا گیا۔ پھر خیال کرو تم نے اپنی قوت سے ان کو مغلوب نہیں کیا بلکہ اس خدا کی تلوار بے نیام ہوئی جو اس گھر کا محافظ ہے۔ خدا نے ان کے دلوں میں اپنا رعب ڈالا اور ان کو ایسی کنکریوں سے سنگسار کیا جن کے زخموں نے ان کے جسموں کو گلا ڈالا۔ تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی لاشوں کے انبار دیکھے، پھر خدا نے جھنڈ کی جھنڈ

چڑیاں بھیجیں جنھوں نے عظیم الجثہ ہاتھیوں اور سربلند بادشاہوں کی لاشوں کا گوشت نوچا اور تمھاری مقدس وادی کو تعفن سے پاک کیا اور تم کو ایک بڑی زحمت سے بچا کر اپنے جلال قدرت کی ایک دوسری نشانی کا مشاہدہ کرایا۔ نعمت و نقمت کی ان حیرت انگیز مثالوں کے بعد خدا کی نافرمانی اور اس کے شعائر کی توہین کی جرأت کیسے کرتے ہو؟

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ چڑیوں نے ان کی لاشوں کو کھایا، تفصیل طلب ہے۔ دیکھو فصل (۹-۱۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس سورہ میں وجوب شکر کی تمہید ہے۔ یعنی اللہ کے مقدس گھر کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور اہل مکہ کو خصوصاً عزت و عظمت اور امن و رزق کی جو نعمتیں حاصل ہیں، ان کو یاد دلا کر ان کو شکر گذاری کا فرض یاد دلایا گیا ہے۔ گویا یہ پوری سورہ صرف نعمتوں اور برکتوں کے بیان میں ہے۔ اس کے بعد کیا ہونا چاہئیے؟ اس سوال کا جواب یہ سورہ نہیں دیتی۔ بعد والی سورہ مستقلاً اسی سوال کے جواب میں ہے جس میں فرمایا گیا ہے "فلیعبدوا رب ہذا البیت" پس چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ اس نعمت کے بیان کے لئے ایک سورہ مخصوص کی گئی تاکہ جس نعمت نے

ان کو تمام عالم حتی کہ بنی اسرائیل پر بھی فوقیت بخشی، اس کی قدر و قیمت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔ بنی اسرائیل کو تمام شرف و امتیاز کے باوجود قتل و قید کی تمام تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا حتیٰ کہ یروشلم اور مقدس ہیکل دونوں ان سے چھن گئے اور بری طرح برباد ہوئے لیکن خدا کا یہ مقدس گھر ہمیشہ محفوظ و مصئون رہا وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ لیکن یہ فضیلت ہمیشہ خدا کے علم و حکمت کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر مغرور ہونے کے بجائے خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ اب ہم چند سطروں میں اس فضیلت کے اسباب و وجوہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ اس کی حکمت واضح ہو سکے۔

خانہ کعبہ اور بنی اسمٰعیل کے فضائل و خصوصیات

۲۔ قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں پچھلی قوموں کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے عدل و حکمت کی بے شمار نشانیاں پنہاں ہیں۔ ان پر غور کرنے سے مکہ اور اہل مکہ، یروشلم اور اہل یروشلم کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے چند ہم یہاں بیان کرتے ہیں اور اس بحث میں بیشتر استناد تورات سے ہو گا تاکہ ہمارے نتائج بحث اہل کتاب پر حجت ہو سکیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خانہ کعبہ دین الہٰی کی اصل و اساس ہے۔ یہ پہلا گھر ہے جو توحید اور غربا پروری کا مرکز ہوا۔ خانہ کعبہ کی اس خصوصیت کا بیان تورات میں بھی ہے۔ لیکن یہود نے اس پر تحریف کے پردے ڈالدیئے ہیں۔ لیکن صاحب نظر آج بھی اس کی جھلک تورات میں دیکھ سکتا ہے مفصل بحث آیت ذیل کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	بے شک عبادت کا پہلا گھر جو لوگوں
لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ	کے لئے تعمیر ہوا وہی ہے جو مکہ میں ہے
هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ	سراپا خیر و برکت اور دنیا والوں کیلئے
اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ	ہدایت، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں
اِبْرٰهِيْمَ ۝ وَمَنْ دَخَلَهٗ	ہیں، ابراہیم کی سکونت، جو شخص
كَانَ اٰمِنًا ۝ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ	اس میں داخل ہوا وہ مامون ہو
حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ	اور لوگوں میں سے جو وہاں جاسکتے
اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۝ (آل عمران۔ ۹۶-۹۷)	ہوں، ان پر خدا کیلئے اس گھر کا حج کرنا

اس آیت میں اس گھر کے اولین عبادت گاہ اور بنائے ابراہیمی ہونے کی تین دلیلیں بیان فرمائی ہیں۔ پوری تشریح آیت کی تفسیر کے ذیل میں گذر چکی

ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا پہلا گھر خدا کی حفاظت کا زیادہ حقدار تھا کیونکہ وہی دین کی اصلی بنیاد تھا۔ یروشلم کی مسجد جیسا کہ تورات سے معلوم ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر ہے، اس سے پہلے یہود کے پاس کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ سلاطین باب ۸: ۱۶ میں ہے۔

"جس دن سے میں اپنی گروہ اسرائیل کو مصر سے نکال لایا تب سے میں نے
سارے اسرائیلی فرقوں میں سے کسی شہر کو جس میں میرا گھر بنایا جائے اور
اس میں میرا نام ہو چن نہ لیا۔"

۲۔ خانہ کعبہ کی فضیلت کا دوسرا پہلو اس کے بانی کی عظمت ہے۔ اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ برعکس اس کے بیت المقدس کو، جیسا کہ تورات میں تشریح اور قرآن میں اشارہ ہے، پابند اور محکوم مزدوروں نے بنایا، پھر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کے وقت دعا فرمائی۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ — اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ — کی بنیادیں اس دعا کے ساتھ اونچی
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ — کر رہے تھے کہ اے ہمارے پروردگار
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (البقرہ ۱۲۷) — ہماری دعا قبول فرما بیشک تو سننے والا .. اور جاننے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کے لئے امن و برکت کی دعا فرمائی اور چاہا کہ یہ امن و برکت صرف مومنین کے لئے مخصوص ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مقدس گھر کی برکتوں کو دنیا کی زندگی میں مومن و کافر دونوں کے لئے عام کر دیا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ	اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے دعا کی
اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا	اے پروردگار اس کو پر امن سرزمین
وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ	بنا اس کے ساکنوں کو پھلوں کی
مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ	روزی دے جو ان میں سے اللہ پر اور
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ	آخرت پر ایمان لائیں۔ خداوند نے
كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ	فرمایا اور جو کفر کریں گے ان کو بھی
أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ	کچھ دن (دنیا کی زندگی میں) نفع
النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ	پہنچاؤں گا، پھر ان کو آگ کے
(البقرہ - ۱۲۶)	عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ
	برا ٹھکانا ہے۔

خانہ کعبہ کی حرمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات پسند فرمائی کہ ابراہیم کی اولاد اپنی ناشکری کی سزا اس پر امن سرزمین میں پائے۔

اس کے برعکس مسجد یروشلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ سلاطین (۱ب ۹: ۱-۹) میں یوں مذکور ہے۔

اور ایسا ہوا کہ جب سلیمان خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر بنا چکا اور سلیمان کی ساری تمنا جو اس کے دل میں تھی پوری ہو چکی تو خداوند سلیمان کو دوسری بار دکھائی دیا جس طرح کہ جبعون میں دکھائی دیا تھا اور خداوند نے اس سے کہا۔ میں نے تیری دعا اور تیری مناجات جو تو نے میرے آگے کی، سنی ہے اور اس گھر کو جو تو نے بنایا کہ میرا نام ابد تک اس میں رہے مقدس کیا، اور میری نگاہ اور میرا دل سدا اسی پر رہے گا اور اگر تو میرے حضور ایسی چال چلے گا جیسے تیرا باپ داؤد دل کی راستی اور صداقت سے چلا اور ان سب حکموں پر جو میں نے تجھ سے کئے عمل کرے گا اور میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو حفظ کرے گا تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل میں ہمیشہ قائم رکھوں گا جیسے میں نے تیرے باپ داؤد سے عہد کیا اور کہا کہ تیرے یہاں مرد کی کمی نہ ہوگی، جو اسرائیل کے تخت پر بیٹھے، پر اگر تم یا تمہاری اولاد میری پیروی سے کسی طرح برگشتہ ہو گئے اور تم میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو جو میں نے تمہیں بتائیں، حفظ

نہ کروگے اور اجنبی معبودوں کو عبادت کرنے جاؤگے اور انھیں سجدہ کروگے
تو میں اسرائیل کو اس سرزمین سے جو میں نے انھیں دی ہے فنا کرونگا
اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لئے مقدس کیا ہے اپنی نظر سے
گرا دونگا اور اسرائیل تمام جہان میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا
اور اس بلند گھر کے برابر سے جو کوئی گذرے گا حیران ہوگا اور سیٹی بجائیگا
اور وہ کہیں گے خداوند نے اس سرزمین اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا
تب وہ جواب دیں گے یہ اس لئے ہوا کہ انھوں نے خداوند اپنے خدا
کو جو ان کے باپ دادوں کو زمین مصر سے نکال لایا ترک کیا اور اجنبی
معبودوں کو اختیار کیا اور انھیں سجدہ کیا اور ان کی بندگی کی اس لئے
خداوند نے ان پر یہ سب بلا نازل کی ۔"

بعینہ یہی مضمون یرمیاہ ۲ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضوع
قلب اور تقوی کے ساتھ اگر حقیر سے حقیر چیز بھی خدا کے حضور میں پیش کیجائے
تو قبولیت کی عزت پاتی ہے۔ ہابیل و قابیل کے قصہ میں بھی اس حقیقت
کی طرف اشارہ ہے۔ ہر چند ان دونوں مقدس مسجدوں کی بنیاد تقوی اور
محبت الہی پر ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مسجد یروشلم قیمتی پتھروں

اور سونے چاندی کی ایک تعمیر تھی جو مقہور و مجبور مزدوروں کے ہاتھوں بنی تھی

(دیکھو سلاطین ب ۵ - ۱۲)

۳- خانۂ کعبہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنایا۔ اسکے لئے ان کو آبائی وطن سے ہجرت کا حکم ہوا۔ اس کی جگہ کی تعیین خود خدا نے فرمائی اور ہوشیار کر دیا کہ جو لوگ اس مقدس گھر میں الحاد اور ظہر کے مرتکب ہوں گے اور اس کی حرمت کو بٹہ لگائیں گے اللہ تعالیٰ ان کو غارت کرے گا۔ چنانچہ اصحاب فیل کے ساتھ اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ چاروں باتیں جو قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہیں، تورات میں اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہیں ہیں کیونکہ یہود نے ان کو نکال دیا ہے تاہم کچھ مخفی اشارات ہیں جو قرآن کی تاکید کرتے ہیں۔ مسجد یروشلم کا حال یہ نہیں ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک عبادت گاہ بنانی چاہی لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ یہ کام سلیمانؑ کے ہاتھوں انجام پائے گا چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جس طرح اور جس جگہ مناسب سمجھا اسکی تعمیر کی، سموعیل ثانی (ب ۷: ۱- ۱۷) میں ہے۔

اور ایسا ہوا کہ جب بادشاہ گھر میں بیٹھا تھا اور خداوند نے اسے

اس کے سارے دشمنوں کی بابت ہر ایک طرف سے آرام بخشا تو بادشاہ نے ناتن نبی کو کہا دیکھئے تو میں سرو کی لکڑیوں کے گھر میں رہتا ہوں پر خدا کا صندوق پردوں کے درمیان رہتا ہے۔ تب ناتن نے بادشاہ کو کہا کہ جا سب کچھ کہ تیرے دل میں ہے کر، خداوند تیرے ساتھ ہے۔ اور اسی رات ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا اور اس نے کہا کہ جا اور میرے بندے داؤد سے کہہ، خداوند یوں فرماتا ہے کہ کیا تو میرے لئے ایک گھر جس میں رہتا ہوں بنایا چاہتا ہے؟ سو میں جب سے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا آج کے دن تک کسی گھر میں نہیں رہا، بلکہ خیمے میں یا مسکن میں پھرتا رہا اور جہاں جہاں میں سارے اسرائیلیوں کے ساتھ پھرتا رہا تو کیا میں نے کسی اسرائیلی فرقہ کو جسے میں نے حکم کیا کہ میرے اسرائیلی گروہ کی رعایت کرے، کہا ہے کہ تم میرے لئے سرو کا گھر کیوں نہیں بناتے؟ سو اب تو میرے بندے داؤد سے ایسا کہہ، کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالے میں سے جہاں تو بھیڑیں چراتا تھا اٹھا کے اپنی قوم اسرائیل کا حاکم کیا اور میں جہاں جہاں تو گیا تیرے ساتھ رہا اور تیرے سارے دشمنوں کو تیرے سامنے مارا اور

میں نے ان لوگوں کی مانند جن کا نام دنیا میں بڑا ہے تیرا نام بڑا کیا،
سو اس کے سوا میں اپنی گروہ اسرائیلی کے لئے ایک مکان مقرر کروں گا
اور وہاں انھیں لگاؤں گا تاکہ اپنے خاص مکان میں بسیں اور پھر
آوارہ نہ ہوں اور شرارت کے فرزند آگے کی طرح ان کو دکھ نہ دینگے
اور نہ اس دن کی طرح جس دن سے میں نے قاضیوں کو مقرر کیا
کہ میری اسرائیلی گروہ پر حاکم ہوں اور تجھ کو تیرے سارے دشمنوں سے
آرام دیا پھر خداوند تجھ کو فرماتا ہے کہ تیرے لئے گھر بھی بناؤں گا اور
جب کہ تیرے دن پورے ہوں گے اور تو اپنے باپ دادوں کے
ساتھ سو رہے گا تو میں تیرے بعد تیری نسل کو جو تیری صلب سے ہوگی برپا
کروں گا اور اس کی سلطنت کو قائم کر دوں گا، وہی میرے نام کا
ایک گھر بنائے گا اور اس کی سلطنت کا تخت ابد تک قائم رکھوں گا
اور میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا، سو اگر وہ کوئی خطا
کرے گا تو میں اسے آدمیوں کے کوڑے اور بنی آدم کے تازیانوں سے
تنبیہ کروں گا، پر میری رحمت اس سے جدا نہ ہوگی، جس طرح کہ
میں نے اسے ساول سے جدا کیا جس کو کہ میں نے تیرے آگے سے۔

وقع کیا، بلکہ تیرے گھر اور تیری سلطنت ہمیشہ تک تیرے آگے قائم رہیگی
تیرا تخت ہمیشہ ثابت ہوگا سو ناتن نے ان ساری باتوں اور اس سارے
خواب کے مطابق داؤد سے کہا۔"

اس کے بعد جب حضرت سلیمان نے تعمیر شروع کی تو یہ وحی آئی۔ (سلاطین ۱:۶ ۱۱-۱۳)

اس وقت خداوند کی طرف سے سلیمان پر کلام اترا اور اس نے کہا کہ
اس گھر کی بابت جو تو بناتا ہے اگر تو میری شریعتوں پر چلے گا اور میری عدالتوں
پر عمل کرے گا اور میرے احکام کو ان پر چلنے کے لئے حفظ کرے گا تو میں
اپنے سخن کو جو میں نے تیرے باپ داؤد سے کہا ہے تیرے ساتھ پورا کروں گا
اور میں بنی اسرائیل کے درمیان رہوں گا اور اپنی قوم اسرائیل کو
ترک نہ کروں گا۔"

۴۔ خانہ کعبہ کمال اسلام کی تصویر ہے اس لئے کہ حضرت ابراہیم ذوبیح
اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کی اور انہی باپ بیٹوں نے مل کر اس کی تعمیر او
خدا سے اس کی قبولیت کی دعا کی۔ ہر چند یہود نے توراۃ میں اس قصہ کو بہت
کچھ بدل ڈالا ہے لیکن ان کا جھوٹ بالکل آشکارا ہے۔ انھوں نے زیادہ آ

زیادہ تصرف یہ کیا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ حضرت اسحٰقؑ کا نام رکھ دیا ہے۔ سورہ والصّفٰت میں یہ بحث کسی قدر تفصیل سے گذر چکی ہے اور اس موضوع پر "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" کے نام سے ہمارا ایک مستقل رسالہ بھی ہے۔

۵۔ حضرت ابراہیمؑ کی جو ذریت جوار حرم میں آباد ہوئی، صبر و رضا اس کی فضائل اخلاق کا سب سے زیادہ نمایاں عنصر تھا۔ قرآن اور اسفار یہود، دونوں اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ ہر چند اسفار یہود کی شہادت تحریفات کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے لیکن اتمام حجت کے لئے ہم ان سے بھی تعرض کریں گے۔ قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی جو اولاد حضرت سارہؑ کے بطن سے تھی اس کو انھوں نے ایک شاداب و زرخیز زمین میں آباد کیا جس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری تھیں۔ اور انکی جو اولاد حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھی اس کو بیت اللہ الحرام کے پاس ایک وادی غیر ذی زرع میں بسایا۔ اسفار یہود میں ان دونوں قبیلوں کی علٰحدگی کی وجہ یوں بیان کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے اولاد بخشی تو حضرت سارہؑ کو رشک ہوا اور انھوں نے حضرت ہاجرہؑ کے ساتھ بدسلوکی کی، حضرت ہاجرہؑ نے ذلت و تکلیف نہایت صبر کے ساتھ برداشت کی جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو برکت دی اور اس کا فرشتہ دو مرتبہ ان سے

ہمکلام ہوا۔ حضرت سارہؑ اس شرف سے محروم ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ مذہبی صحیفوں میں وارد ہے کہ خدا کی نوازش مظلوموں اور شکستہ دلوں کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ پیدائش (ب ۱۶: ۱۰)

پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا (یعنی تیری گریہ وزاری)

پیدائش (ب ۲۱: ۱۷-۱۸) میں ہے۔

"اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

ہر چند یہود نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے واقعہ میں بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش کر دی ہے جیسا کہ سورہ ابراہیم کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ تاہم اپنی خواہش کے خلاف انھوں نے بہت سی ایسی باتوں کا اعتراف

کرلیا ہے جو ان کے خلاف حجت ہیں۔

۴۔ بنی اسمٰعیل کی فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنی اسحٰق کی بدسلوکیوں کے باوجود انھوں نے ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔ خود یہود کی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت سارہ تحقیر کی وجہ سے حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہتی تھیں اور یہ بری سنت ان کی اولاد میں بھی باقی رہی، چنانچہ بنی اسحٰق بنی اسمٰعیل کو کنیز کی اولاد کہتے تھے، حالانکہ یہ بات بالکل خلاف حقیقت تھی، بالآخر اس کا انجام یہ ہوا کہ حضرت سارہؑ کی اولاد مصر میں غلام ہو کر بکی۔

پیدائش (ب ۳۷: ۲۵) میں ہے۔

اور وہ روٹی کھانے بیٹھے اور آنکھ اٹھائی اور دیکھا کہ اسمٰعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے گرم مصالحہ اور روغن بلسان اور مرہ اونٹوں پر لادے ہوئے آتا ہے کہ انھیں مصر کو لیجائیں تب یہودا نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا، آؤ اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچیں اور اس پر اپنے ہاتھ نہ ڈالیں کہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا گوشت ہے اور اس کے بھائی راضی ہوئے اور اس وقت وہ مدیانی سوداگر ادھر سے گذرے سو انھوں نے

یوسف کو کھینچ کے کوئیں سے باہر نکالا اور اسماعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کو بیچا اور وہ یوسف کو مصر میں لائے۔"

اس روایت میں بھی ایک اہم بات بالکل چھپا دی گئی ہے لیکن اس وقت ہم اس کو کریدنا نہیں چاہتے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا، یہ ان کی غلامی کی تمہید تھی۔ اس کے بعد ایرانیوں، مصریوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے ان کو گرفتار کیا اور غلام بنایا۔ اس کے برخلاف حضرت ہاجرہ کی اولاد، اپنی پوری تاریخ میں کبھی غلامی کی ذلت سے آشنا نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کی حفاظت فرمائی۔ بلکہ جیسا کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں گذر چکا ہے بنی اسماعیل نے اپنے بھائیوں کے دشمنوں سے ان کی ذلتوں کا انتقام لیا۔ ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں سے خریدا اور اب ایک عرصہ سے صرف ممالک اسلامیہ ہی ان کے لئے جائے پناہ ہیں اور اگر وہ حضرت سرور عالم صلعم پر ایمان لائیں تو جیسا کہ قرآن مجید اور تورات میں وعدہ ہے، آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام ہوگا اور الحمدللہ اس اقدام سعادت کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔

ان تمام حالات پر غور کرو، کسی موقع پر بھی بنی اسمٰعیل نے ان کو غلام بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جس طرح ایک شریف بھائی ہر موقع پر اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اسی طرح انھوں نے ہر موقع پر ان کی مدد کی اور ان کے دشمنوں سے ان کی ذلتوں کا انتقام لیا۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے خود بیچا تھا، لیکن انھوں نے ان کو غلام بنا کر رکھنا پسند نہیں کیا، بلکہ

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ۝ (یوسف - ۲۰)

اور انھوں نے یوسف کو معمولی قیمت؛ چند درہموں پر بیچ دیا اور وہ اس سے بے رغبت تھے۔

۷- ایک قابل لحاظ حقیقت یہ بھی ہے کہ بنی اسمٰعیل کو بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدا سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ شرارتوں اور بت پرستی کے علاوہ بارہا ایسا ہوا کہ یہود اس منعم حقیقی کو بالکل چھوڑ بیٹھے۔ تورات میں متعدد مقامات پر ان کے شرک کے ساتھ خدا سے ان کی بالکلیہ علیحدگی کا ذکر بھی آیا ہے (دیکھو یرمیاہ ۳ئ) لیکن عربوں نے کسی دور میں بھی اپنے حی و قیوم خدا کا دامن نہیں چھوڑا۔ البتہ انھوں نے اس کے دربار کے لئے بہت سے سفارشی ٹھہرا لئے تھے جن کو نصاریٰ کی طرح خدا کے بیٹوں اور بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا	ہم ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں
اِلَى اللّٰہِ زُلْفٰی	کہ وہ ہم کو خدائے برتر سے قریب کردیں

سورہ یونس میں ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ	وہ خدا کے علاوہ ایسی چیزوں کو
اللّٰہِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا	پوجتے ہیں جو ان کو کسی طرح کا
يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ	نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں
هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا	اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے حضور ہمارے
عِنْدَ اللّٰہِ (یونس - ۱۸)	سفارشی ہیں۔

انھوں نے خدا سے بالکلیہ علیحدگی کبھی نہیں اختیار کی، وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے، اس کے نام کی تکبیر کہتے تھے، اس کی عبادت و پرستش کرتے تھے اسلئے یہود کا کفر عربوں کے کفر سے زیادہ سخت و شدید ہے۔

۸- یہود کے مقابل میں بنی اسمٰعیل کا عذر بھی زیادہ واضح ہے۔ وہ اپنے دیر سے اس وقت سے جب امتداد زمانہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات بالکل فراموش ہوگئیں اور کوئی دوسرا نبی تذکیر و یاددہانی کے لئے مبعوث نہیں ہوا بلکہ اس کے باوجود ان میں ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعد

باقی رہی جو دین حنیفی پر قائم اور بت پرستی سے متنفر تھے۔ برعکس اسکے یہود نے اس نبی کے سامنے گوسالہ پرستی کی جس پر ایمان لائے تھے اور جس کے حیرت انگیز معجزات کا قدم قدم پر مشاہدہ کر رہے تھے، پھر نبی کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد بار بار بت پرستی کی لعنتوں میں گرفتار ہوئے۔ تورات کی کتاب القضاۃ اور سلاطین میں یہ تفصیلات مذکور ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انذار و اتمام حجت کے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ط (الاسراء - ۱۵)

ہم اس وقت تک کسی قوم کو سزا نہیں دیتے جب تک اس کے پاس ایک رسول نہ بھیج لیں۔

بظاہر یہی وجوہ و اسباب ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس مقدس گھر کی ہمیشہ حفاظت کی، وللہ الحمد۔

چند امور مہمہ

۵۔ بنی اسرائیل اور مسجد یروشلم کے مقابل میں، بنی اسمٰعیل اور خانۂ کعبہ کے جو خصوصیات و فضائل اوپر بیان ہوئے ہیں، ان میں بعض اہم تشلمات

ہیں، جن میں سے چند بعض شبہات کے ازالہ کے لئے ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ بندے کے لئے یہ بات کبھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا سے مدعیانہ مطالبۂ حقوق کرے اور یہ سمجھے کہ چونکہ اس میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں، اسلئے وہ فلاں فلاں انعامات کا مستحق ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور اسکی تمام کمالات اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہیں، اسلئے اس کا منصب صرف تذلل واستکانت ہے۔ جو چیزیں بظاہر ایک طرح کی فضیلت نظر آتی ہیں وہ بھی خدا کی طرف سے رحمت کا ایک بہانہ ہیں۔ ایک شخص اگر دعا کرتا ہے تو اسکو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اس نے خدا پر کوئی احسان کر دیا، یا کوئی ایسا کارنامہ انجام دے دیا ہے جس کے بعد وہ خواہ مخواہ خدا کی طرف سے اجر کا مستحق ہو گیا ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ صرف یہ خیال کرنا چاہئے کہ جس رحمٰن و رحیم کی عنایات سے بندہ بن مانگے ہر آن بہرہ مند ہے، وہ مانگنے والے اور گڑگڑانے والے کو اپنے در سے کبھی محروم نہیں لوٹائے گا۔ قرآن مجید اور تورات و انجیل میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے۔ خدا برے اور بھلے دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرے گا، اسکے لئے اس نے آزمائش اور امتحان کا

قانون رکھا ہے، اسی قانون کے بموجب اس نے حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ انھوں نے اپنے عزیز لخت جگر کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا اور باپ بیٹے دونوں بندگی کے امتحان میں پورے اترے۔ بظاہر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے! لیکن غور کرو، انھوں نے خدا کے حضور میں جو چیز پیش کی ان کی تھی؟ خدا ہی کی بخشی ہوئی تھی!

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تاہم یہی بات دریائے رحمت کے جوش میں آنے کا بہانہ بن گئی اور حضرت ابراہیمؑ کے لئے بے پایاں انعامات الٰہی کے دروازے کھل گئے۔

یہ حقیقت بالکل کھلی ہوئی ہے۔ لیکن جب دل سخت اور سیہ کاریوں سے بے نور ہو جاتا ہے تو یہ کھلی ہوئی حقیقت بھی نظر نہیں آتی، اسی لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہیم کیلئے اولاد پیدا کر سکتا ہے (متی باب ۳)

یہود اس خیال میں گویا قدریہ کے پیشرو ہیں، اسکے برعکس نصاریٰ نے

دوسری طرف غلو کیا اور اعمال کو یکقلم لاحاصل قرار دے دیا، جس کی دوسری مثال جہمیہ ہیں۔ اس تفصیل سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ فصل میں بنی اسمٰعیل کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں وہ سب توفیق الٰہی کے ثمرات ہیں۔ اسلئے اس کو حق تھا کہ اپنے احسانات یاد دلاکر انھیں اپنی طرف لوٹنے اور صرف اپنی ہی بندگی و اطاعت کی دعوت دے۔

۲۔ جس طرح کسی بندے کو کبھی استحقاق کا گھمنڈ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ خدا کے کرم اور اس کے وعدوں پر بھروسہ کرنا چاہئے، اسی طرح کسی مسجد یا معبد کے متعلق جس کی تعمیر خدا کے نام پر ہوئی ہو، یہ خیال نہیں کرلینا چاہئے کہ اس کی حفاظت وصیانت خدا پر فرض ہوگئی۔ زیادہ سے زیادہ صرف یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اسلئے جو چیز اسکے حضور میں قربت کا ذریعہ ٹھہرائی گئی ہے وہ اس کی نگرانی وحفاظت سے محروم نہ ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر بیت اللہ کے وقت اور حضرت سلیمانؑ نے تعمیر بیت المقدس کے وقت نہایت الحاح وزاری کے ساتھ خدا سے ان کی قبولیت کی دعا مانگی، کہ عبادت و بندگی اور تقرب ونیازمندی کے یہ مرکز اس کی حفاظت ونگرانی سے محروم نہ ہوں، لیکن یہ اسی وقت تک جب تک یہ تقرب وبندگی کے مرکز ہوں، اگر یہ حقیقت فراموش ہو جائے اور لوگ اللہ کے عہد کو بھلاکر اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیں، تو وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں

کہ جو چیز ہدیہ نیاز بنکر ان کے اگلوں کے لئے تقرب کا ذریعہ ہوئی، وہی لعنت کا پتھر بنکر پچھلوں کی تمام عظمت کو پارہ پارہ کر دے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ ایسا فوراً ہو، خدا رحمت میں جلدی کرتا ہے لیکن عذاب میں جلدی نہیں کرتا۔ تورات اور قرآن میں اس بات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ بات بھی منجملہ بدیہیات کے ہے۔ لیکن جن آنکھوں پر باطل آرزوؤں کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کو نظر نہیں آسکتی۔ ایسے لوگ یہی خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے متعلق ہر قسم کے استحقاق کی ایک دائمی سند حاصل کر لی ہے۔ فصل دوم کے آخر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر غور کرو، سورۂ توبہ کی اس آیت میں بھی یہی اشارہ ہے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ	کیا تم، ان لوگوں کو جو حاجیوں کو پانی
وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	پلاتے ہیں اور مسجد حرام کا انتظام
كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	کرتے ہیں ان کے ہم رتبہ سمجھ لیا جو
الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ	اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور خدا
اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ	کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے حضور
(توبہ - ۱۹)	میں وہ برابر نہ ہوں گے۔

پس سب سے زیادہ قریب ترین وسیلۂ تقرب، طاعت و تقویٰ ہے۔ تمام

شعائر کا قیام و بقا اسی مقصود کے لئے ہے۔ بندہ کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے پروردگار کا شکر گذار اور اس کی رحمتوں کا امیدوار رہے، استخفاف کا وسوسہ دل میں گذرنے نہ دے۔

۳۔ خداوند تعالیٰ جب کسی گھر کو قبول فرما کر، اس کو اپنے نام کی نسبت سے مقدس کر دیتا ہے (اور یہ شرف صرف متقین ہی کے بنائے ہوئے گھروں کو حاصل ہوتا ہے، اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ٥) تو وہ گھر اس کی برکتوں کا سرچشمہ اور اس کے عہد و میثاق کی تجدید کے لئے گویا اس کا دایاں ہاتھ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک لوگ خلوص قلب اور تجدید عہد کے عزم کے ساتھ اس کی چوکھٹ پر حاضر ہوتے ہیں، وہ عہد قائم رہتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل سے فرمایا گیا۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرہ۔ ۴۰) — تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔

اور بنی اسمٰعیل سے فرمایا گیا۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ۔ ۱۵۲) — تم مجھ کو یاد رکھو میں تمھیں یاد رکھوں گا۔

لیکن جب وہ اس عہد کو توڑ دیتے ہیں اور گویا خود اس گھر کو ڈھانے کے لئے تیشے لیکر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو خداوند تعالیٰ جو تمام عالم سے بے نیاز ہے،

اُن کو چھوڑ دیتا ہے اور وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے، اس کا یہ فیصلہ قوم کی اکثر حصہ کی حالت پر مبنی ہوتا ہے یا تو کسی قوم کا بڑا حصہ نافرمان اور عہد شکن ہو جاتا ہے، اسلئے وہ بربادی کے حوالہ کر دی جاتی ہو یا نافرمان تو تھوڑے ہوتے ہیں، لیکن اکثریت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غافل رہتی ہے، ایسی حالت میں بھی قوم تباہ ہو جاتی ہے، کیونکہ تقویٰ کا نصف حصہ تعاون علی الخیر اور منع شر ہے۔ سورۂ والعصر میں ہم اس کو مفصل بیان کر چکے ہیں، یہ جو ہم نے کہا ہے، عدل الٰہی کا عام اور کھلا ہوا قانون ہے کبھی خداوند تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوتی ہے کہ کسی قوم کی نادانیوں سے درگذر کرے یا کسی خاص بہتری یا کسی خاص حکمت کی وجہ سے جس کو صرف وہ حکیم اور علام الغیوب ہی جانتا ہے، شریروں کا ہاتھ فوراً نہ پکڑے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کو بالکل بدل ڈالا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مہلت دی، برخلاف قرآن مجید کے، کہ شریروں اور کج اندیشوں نے بہتیرا چاہا کہ اس میں دست اندازی کریں لیکن اس کا ایک نقطہ بھی اس کی جگہ سے ہٹانے کی ان کو فرصت نہ مل سکی۔

"اصحاب فیل کا واقعہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق"

۶۔ "اصحاب فیل" کا واقعہ، اجمالاً اور تفصیلاً، دونوں طریقہ سے بیان کیا

گیا ہے۔ اجمالاً تو خود قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے اور اس کی تفصیلی شکل وہ ہے، جو مختلف قسم کی صحیح و ضعیف روایات سے اخذ کرکے پیش کی گئی ہے۔ مفسرین عمومًا قصہ کی تمام تفصیلات، روایات سے اخذ کرکے بیان کرتے ہیں اور ضعیف و قوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل مضر اور عمومًا صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ واقعہ کی منصوص شکل روایات سے بالکل الگ کرکے دیکھی جائے۔ اسکے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور کمزور روایات کو چھانٹ کر الگ کیا جائے۔ پہلے قرآن مجید پر غور کرنا چاہئے۔

قرآنِ مجید نے، اس واقعہ کو نہایت مجمل طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اس سے نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ اور نہ یہ معلوم پتہ چلتا کہ کعبہ کے ڈھانے کے لئے آئے تھے۔ اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ نہایت مشہور تھا، حتیٰ کہ عربوں نے اسی سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا اور ان کے اشعار میں بکثرت اس کا تذکرہ ہوا (دیکھو فصل ۱۰) اور چونکہ اجمالی بیان کسی واقعہ کی غایت شہرت کی دلیل ہے، اس لئے بلاغت قرآن نے اسی پہلو کو ترجیح دی۔ چنانچہ کلام کا آغاز "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ" سے ہوا ہے۔ یہ طریق خطاب اسی وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب جماعت کا ہر فرد واقعہ سے اس طرح واقف ہو گویا اس کا

بنی شاہد ہے۔ کسی امر کا اقرار کرانے کے لئے بھی عربی زبان میں یہی اسلوب ہے۔
ب یہ انداز کلام اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی مشہور و معروف ہی بات کا
کر آتا ہے، ایسے مواقع پر تفصیل مناسب نہیں ہوتی۔ مثلاً سورہ فجر میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ	کیوں دیکھا نہ تیرے خداوند نے عاد کے
بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ	ساتھ کیا کیا؟ ستونوں والے ارم کے ؟
الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا	جس کا نظیر کسی ملک میں نہیں تھا اور ثمود
فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُودَ الَّذِينَ	کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر کاٹے
جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝	اور میخوں والے فرعون کے ساتھ،
وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝	یہ سب جنھوں نے ملک میں سر اٹھائے
الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝	اور بڑی بڑی خرابیاں ڈالیں، سو تیرے
فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝	خداوند نے ان پر عذاب کے تازیانے
فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ	برسائے۔
عَذَابٍ (الفجر۔ ۶۔ ۱۳)	

. . . .

دیکھو، ان قوموں کی جو خصوصیتیں نہایت مشہور تھیں انہی کی طرف اجمالی
اشارے کر دئے ہیں۔ اسی طرح اصحاب فیل کے قصے میں بھی، اجمالی اشارہ ہی

مناسب تھا۔ تمام واقعہ میں سے اتنا حصہ بیان کر دیا جانا اس سورہ اور بعد والی
سورہ کے موقع اور نظم کا تقاضا تھا۔ گویا قصہ کا اجمالی خلاصہ یہ ہوا کہ اصحاب فیل
جنھوں نے بیت اللہ کی تخریب کی سازش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا
اس کی بے شمار فوجوں میں سے ایک فوج نمودار ہوئی اور اس نے پتھراؤ کر کے
ان کو پارہ پارہ کر دیا تاکہ ان کو حرم کے ساتھ گستاخی کی سزا دے اور عرب
خصوصاً قریش پر احسان فرمائے۔

واقعہ کا اتنا حصہ منصوص ہے۔ اس میں روایات کو خلط نہیں کرنا چاہیے
روایات پر الگ غور و بحث کرنا چاہیے تاکہ صحیح واقعہ منقح ہو سکے۔ اب ہم اس کی
طرف متوجہ ہوتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ تین عنوانوں سے غور کریں گے۔

۱۔ وہ روایات جو ابرہہ کے حملہ اور عربوں کے ساتھ اس کے واقعات
وحالات سے متعلق ہیں۔

۲۔ وہ روایات جو اصحاب فیل کی سنگباری سے متعلق ہیں۔

۳۔ روایات متعلق واقعہ طیر۔

ابرہہ کے حملہ کا سبب، اہل مکہ کا فرار، عبد المطلب سے گفتگو

[illegible] سے ناراض ہو گیا

لیکن یہ وجہ اور اہل مکہ کے فرار اور ابرہہ و عبدالمطلب کی گفتگو سے متعلق، جو حالات بیان کئے گئے ہیں، سب یکقلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند، ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق تک منتہی ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ نیز دوسری روایات سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ پھر عربوں کا مشہور کیرکٹر بھی ان باتوں سے ابا کرتا ہے۔

خود واقعات کی نوعیت سے، صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام باتیں دشمنوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ ان میں عربی غیرت وحمیت کی علانیہ تحقیر اور قریش کے غیور سردار عبدالمطلب کی بیباکانہ توہین ہے۔ ابرہہ کے کیرکٹر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ ایک شخص پر ایک کنیسہ کی توہین کا الزام تراش کر بیت اللہ الحرام پر ابرہہ کے حملہ کو جائز دکھایا گیا ہے۔ الغرض ذلت و دنائت اور بے غیرتی و دوں ہمتی کا کوئی ایسا الزام نہیں ہے جو قریش اور عرب اور ان کے سردار پر نہ تھوپا گیا ہو۔ ان خرافات کی تردید پر زیادہ وقت ضایع کرنے کا موقع نہیں ہے تاہم مختصراً ان وجوہ کو دکھانا ہے، جن سے ان روایات کی تکذیب ہوتی ہے۔

۱۔ بیان کیا جاتا ہے، جب ابرہہ نے حملہ کیا، عبدالمطلب نے کہا، اس گھر کا

اس کی حفاظت کرے گا، اس کے بعد خانۂ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک دعا مانگی اور تمام اہل مکہ کو لیکر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا چھپے، لیکن دنیا کے پردے میں، کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو، پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ بغیر کسی مدافعت کے، اپنا معبد دشمنوں کے حوالہ کر کے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اس طرح کی بے حمیتی تو ہم دنیا کی ادنیٰ قوموں کی نسبت بھی باور نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ قریش اور بنی اسمٰعیل جن کا تمام تر سرمایۂ فخر و نازش ہمیشہ شہسواری، شمشیر زنی اور قدر اندازی ہی رہا ہے۔ یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ نہ آنے دی۔

۲۔ روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے کچھ اونٹ ابرہہ کے آدمی ہنکا لے گئے تھے۔ عبدالمطلب ان کے مانگنے کے لئے ابرہہ کے پاس گئے۔ ابرہہ نے ان کی نہایت عزت کی۔ تخت شاہی سے اتر کر فرش پر بیٹھ گیا اور ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا پھر گفتگو شروع ہوئی۔ اس نے کہا "آپ اپنے سو اونٹوں کے لئے مجھ سے ملنے آئے، حالانکہ میں کعبہ کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں، جو آپ کا اور آپ کے آباؤ اجداد کا دینی مرکز ہے، لیکن آپ اس کی نسبت مجھ سے ایک حرف نہیں کہتے" غور کرو، عبدالمطلب کے ساتھ جس اخلاق سے وہ پیش آیا اور جس طرح باتیں کیں اس سے پوری امید تھی کہ اگر وہ اس سے

خانہ کعبہ کے بارہ میں کوئی خواہش کرتے تو وہ رد نہ کرتا، ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ اس معاملہ کو وہ بالکل ٹال جاتے؟ پھر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی قرشی حمیت نے چند اونٹوں کے لئے، اس کی خوشامد کا ننگ کیونکر گوارا کیا!

۴۔ اہل سیر تسلیم کرتے ہیں کہ ابرہہ کے حملہ کے روز اول سے، قبائل عرب، وقتاً فوقتاً اس کی فوج پر تاخت کرتے رہتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب عموماً اس کے مخالف بلکہ آمادۂ جنگ تھے۔ ابرہہ کے ساتھ ان کی معرکہ آرائیوں کا ہر جگہ چرچا تھا، بعض شعراء نے اس پر فخریے لکھے۔ قدیم اسلامی شاعر ذوالرمہ کہتا ہے ؎

وابرھۃ اصطادت صدور رماحنا جھارا وعثنون العجاجۃ اکدر

اور ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا

تنحی لہ عمرو فشک ضلوعہ بنافذۃ نجلاء والخیل تصبر

عمرو نے اسکی طرف لپک کر، نیزے کے کاری زخم سے اسکی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم تھے

ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ اس کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا، کثیف غبار آسمان تک بلند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ہوا کا طوفان بھیجکر ان پر سنگریزوں کی بارش کی تفصیل دسویں فصل میں آئے گی۔ الغرض یہ مسلم ہے کہ عربوں نے اپنے مقدس شہر کی حفاظت

کی یہ بات ہر طرح قرین عقل ہے۔ تمام عرب دل سے کعبہ کی عزت کرتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اس قدر مرعوب ہو جائیں کہ اس چیز کی حمایت کیلئے بھی ان کے خون میں کوئی حرارت نہ پیدا ہو جس پر ان کی تمام عظمت و سیادت کی بنیاد تھی۔ دین و مذہب کا سوال چھوڑ دو، وہ اپنے آبائی شرف کی تمام کائنات جیتے جی کیسے برباد ہوتے دیکھ سکتے تھے!

۴۔ علمائے سیر کے بیان کے مطابق، ابرہہ کا حملہ موسم حج میں ہوا تھا۔ بعض شعراء کے اشعار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ابرہہ کے آدمی قربانی کے کچھ اونٹ بھی ہنکالے گئے تھے۔ عکرمہ بن ہاشم بن عبد مناف نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

لاهم اخز الاسود بن مقصود　　　الاخذ الهجمة فيها التقليد

خداوندا! اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے، ہنکالے گیا۔

بین حراء وثبیر فالبید　　　یحبسها وهی اولات التطرید

حراء، ثبیر اور بید کے درمیان ان کو روکا اور وہ ہنکالے جانے کے لئے تھے۔

فضمها الی طماطم سود　　　اخفره یا رب وانت محمود

پھر ان کو حبشی غلاموں کے حوالہ کیا، خداوندا تو اس کو اپنی امان سے محروم کر دے

تو سزاوار حمد ہے۔

اسلئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قریش ہمت ہار گئے تھے، تو کیا تمام عرب نے سپر ڈالدی تھی؟ اور یہ پڑھ چکے ہو، کہ ان کے یکّا دکّا قبائل، وقتاً فوقتاً، ابرہہ کی فوج پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ پھر تعجب ہے کہ جب ایک مرکز سے پوری مجتمعہ طاقت کے ساتھ، عین کعبہ کے سامنے، دشمن سے مقابلہ کا وقت آیا تو سب دبک گئے! ایسی فضول بات کون باور کر سکتا ہے؟۔

۵۔ عرب شعراء نے قبیلۂ ثقیف کی ہجو کی ہے کہ خانہ کعبہ کی حمایت کے وقت اس نے بزدلی دکھائی اور دشمن سے سازباز کر لیا۔ چنانچہ ضرار بن خطاب کا شعر ہے۔

وفرت ثقیف الی لاتھا بمنقلب الخائب الخاسر

اور ثقیف ایک نامراد بھاگنے والے کی طرح اپنے معبود لات کی طرف بھاگ گئے

ابرہہ کے ساتھ قبیلۂ ثقیف کے سازباز پر تمام روایات متفق ہیں اور ابورغال ثقفی کی قبر، اس گناہ پر کہ اس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا، سنگسار کی گئی۔ پھر غور کرنے کی بات ہے کہ اگر ثقیف کی طرح تمام عرب بھاگ گئے تھے

تو قبیلۂ ثقیف اور ان کا سردار ہی کیوں مستحق ملامت ٹھیرا؟ ان کا عذر بھی بالکل واضح تھا۔

۶۔ کہا جاتا ہے کہ ابرہہ نہایت بردبار آدمی تھا۔ وہ اس قسم کا اقدام نہ کرتا لیکن قبیلۂ فقیم کے ایک آدمی نے ایک کنیسہ میں گھس کر بقصد توہین اس کو نجس کر دیا، جس سے اس کو اشتعال ہوا، اور اس نے خانہ کعبہ پر فوج کشی کر دی۔ لیکن ابرہہ کی پوری سوانح عمری اس حسن ظن کے خلاف ہے۔ وہ نہایت متعصب تھا۔ اس نے جب یمن پر قبضہ کیا، وہاں کے یہودی امیر اریاط کو قتل اور یمن سے یہودیت کا بیخ و بن سے خاتمہ کر دیا، پھر ایک شاندار گرجا بنوایا اور نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لئے ایک ایسا گرجا تعمیر کرایا ہے جس کی نظیر چشم فلک نے نہ دیکھی ہو گی۔ میں نے تہیہ کیا ہے کہ عربوں کے حج کا رخ بھی اسی طرف پھیر دوں۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ابرہہ نے ٹھیک سوچا، خانہ کعبہ کی محبت عربوں کے خون میں گھلی ہوئی تھی۔ وہ اس کو اپنے باپ ابراہیمؑ کی تعمیر اور اپنا دینی و دنیاوی مرکز سمجھتے تھے۔ ان کو اس سے پھیرنا ناممکن تھا۔ اس سنگ گراں کو راہ سے ہٹانے کی تدبیر صرف یہی تھی کہ اس کو یکقلم ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ واقعات کا یہ سلسلہ بالکل فطری معلوم ہوتا ہے باقی کنیسہ کو نجس کر دینے کا واقعہ تو بالکل گڑھا ہوا

معلوم ہوتا ہے۔ یا تو اس لئے گڑھا گیا ہو کہ ابرہہ کی برہمی کا کوئی سبب پیدا کیا جائے یا بوجہ حسن ظن اس کی اس شنیع جرأت کے لئے ایک وجہ عذر تلاش کی گئی ہے۔ درمنثور میں اسی قسم کی ایک اور روایت بھی ہے، جس میں حملہ کا سبب دوسرا بتایا گیا ہے۔ لیکن مقصود ایک ہی ہے۔

"عثمان بن مغیرہ بن اخنس سے روایت ہے کہ اصحاب فیل کا قصہ یوں ہے کہ ابرہہ اشرم حبشی یمن کا بادشاہ تھا، اس کا نواسا اکسوم بن صباح حمیری حج کے لئے گیا، مکہ سے واپسی میں نجران کے ایک گرجے میں اترا اہل مکہ کی ایک جماعت نے گرجے پر ڈاکہ ڈالا اور گرجے کے سامانوں کے ساتھ اکسوم کا تمام سامان بھی لوٹ لیا، اکسوم نے اپنے نانا سے فریاد کی، اس نے اپنے درباریوں میں سے ایک شخص شہر بن معقود کی قیادت میں بیس ہزار آدمی روانہ کئے۔"

اصحاب فیل کے حملہ کے متعلق صاحب درمنثور نے اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن اس کی لغویت بالکل واضح ہے۔ جب ایسی روایات موجود ہیں، جو ابرہہ کے حالات اور واقعات کی طبعی رفتار سے پوری مطابقت رکھتی ہیں تو اس قسم کی روایات لینے کی کیا ضرورت ہے۔

۷۔ قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب فیل نے ایک مخفی تدبیر (کید) کی تھی، لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں، ان میں مخفی تدبیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ قوت کی نمائش اور عرب کی تذلیل کی ایک کھلی ہوئی کارروائی ہے۔ البتہ قابل اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی تدبیر) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ اس نے اشہر حرم میں حملہ کیا، کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج میں ہوتے ہیں۔

۳۔ اس نے خاص طور پر ایام تشریق میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں مقیم ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آرہے ہوں گے۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اب غور کرو کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی چالوں کو کس طرح برباد کیا۔

۱۔ ان کی فوج کو بطن محسر ہی میں روک دیا۔

۲۔ محسر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا۔

۳۔ خدا نے آسمان سے سنگریزے برسانے والی آندھی بھیجی۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اہلِ مکہ نے پوری قوت سے اصحاب فیل کا مقابلہ کیا اور ان پر پتھراؤ کیا۔ باقی رہی ابرہہ کی بردباری اور شرافت کی داستان تو یہ عقل و نقل اور قرآن، سب کے خلاف ہے۔

اصحاب فیل پر سنگباری

۸۔ اصحاب فیل پر سنگباری کا واقعہ کعبہ کی عظمت اور آنحضرت صلعم کی بعثت کی ایک عظیم الشان نشانی ہے، چنانچہ جیسا کہ بعض پیشینگوئیوں میں اشارہ تھا، آنحضرت صلعم اسی سال پیدا ہوئے۔ لیکن اس نشانی کی عظمت اس کے عجیب اور خارق عادت ہونے میں نہیں ہے۔ نشانیوں اور معجزوں کے ظہور کے لئے جو عام قانون الٰہی ہے، یہ نشانی بھی بالکل اس قانون کے اندر ہے۔ قدرت کے تمام کارخانۂ خلق و ایجاد میں پردہ داری کی جو شان ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کارفرمائے غیب کی وہ شان حجاب، معجزات و خوارق کے ظہور میں بھی اسی طرح قائم رہتی ہے۔ اس کی حکمت نے عالم غیب اور عالم شہود کے مابین اسباب و علل کے پردے ڈال دیئے ہیں اور اس کی مرضی یہ ہے کہ ہم اسکے

جمال و جلال کا مشاہدہ ان پردوں کے آڑ سے کریں، تاکہ امتحان و آزمائش اور تربیت اخلاق کے مصالح مفقود نہ ہوں، کافر ان حجابات میں کھوجاتا ہے۔ لیکن مؤمن کی نگاہِ قلب ان سے گذر کر شاہد حقیقی کا مشاہدہ کرتی ہے۔ ان خوارق کا قدرت کے عام ضابطہ کے مطابق ہونا گویا خدا کے اس امرو حکم کے سمجھنے کا ایک وسیلہ ہے جو تمام کارخانۂ خلق کا قوام ہے۔

صُنْعَ اللهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (النمل۔ ۸۸) اس خدا کی نادرہ کاری جس نے ہر چیز کو مکمل بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں خوارق کے لئے کوئی مخصوص لفظ نہیں آیا، عام مظاہر فطرت کے لئے آیات (نشانیوں) کا لفظ استعمال ہوا ہے، بعینہ یہی لفظ قرآن نے خوارق کے لئے بھی استعمال کیا۔ صرف عام عقول کی رعایت سے کہیں کہیں "بینات"، (واضح کھلی ہوئی) کا لفظ آگیا ہے۔ باقی رہے اہل نظر تو ان کے نزدیک تمام عالم بینات ہے، اس پر تفصیلی بحث ہماری کتاب عیون العقائد میں ملے گی۔ ہمارا اصلی عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ تمام کائنات خدا کے دست تصرف میں ہے۔ اس کے ملائکہ اس کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں اور یہ تمام کارخانہ اسکے حکم کے مطابق ایک نظام حکمت پر چل رہا ہے۔ اس یقین کے بعد انسان

خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کا اہل ہوتا ہے اور اس کی خشیت و حکمت میں افزونی ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب واقعۂ فیل پر غور کرو، قرآنِ مجید اور صحفِ یہود میں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں موجود ہیں، جن سے آنحضرت صلعم اور حضرت موسیٰ کی باہمی مشابہت بھی واضح ہوتی ہے۔

۱۔ اس کی سب سے پہلی مثال غزوۂ بدر میں ملتی ہے، آنحضرت صلعم نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور قریش کی طرف رخ کر کے فرمایا "شاھت الوجوہ" "خدایا یہ چہرے بگڑ جائیں" اس کے بعد کنکریاں ان کی طرف پھینکیں اور صحابہ سے فرمایا "بڑھو"، نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کفار کو آنکھوں کی پڑ گئی۔ اسی کی نسبت سورہ انفال میں فرمایا ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال ۱۷)	جب تم نے کنکریاں ماریں تو تم نے نہیں ماریں بلکہ اللہ نے ماریں۔

دیکھو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی رمی، کو اپنی رمی کے لئے ایک سبب ظاہر اور پردہ بنایا۔ گو اس موقع پر دو طرف سے کنکریاں پھینکی گئیں، ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو کفار نے دیکھا اور ایک خدا کی طرف سے جس کو وہ نہ دیکھ

سکے۔ لیکن اسکے اثر کو انھوں نے محسوس کیا۔ اسی لئے آیت میں نفی واثبات دونوں ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ بعینہٖ یہی صورت واقعہ فیل میں بھی نظر آتی ہے۔ قریش سنگباری کے زور سے ابرہہ کی فوج کو، خانہ کعبہ سے دفع کر رہے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اسی پردہ میں، ان پر آسمان سے سنگباری کردی۔ چنانچہ جس طرح غزوۂ بدر کی رمی کو اپنی طرف منسوب کیا (وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى) اسی طرح یہاں کفار کو کھانے کے بھس کی طرح بنا دینا اپنی قوت قاہرہ کی طرف منسوب کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان معجزہ ہے، کیونکہ قریش کیلئے ابرہہ کے لشکر گراں کو پارہ پارہ کرنا تو درکنار اس کو شکست دیدینا بھی آسان نہ تھا۔

۲- یہ معجزہ[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات میں سے چھٹے معجزہ سے مشابہ ہے، کتاب خروج ب ۹: ۸-۱۱ میں ہے۔

اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ دونوں ہاتھ بھر کے
بھٹی کی راکھ سے لو اور موسیٰ اسے آسمان کی طرف اڑائے اور وہ مصر کی

---

[1] مصنفؒ نے ان مواقع پر آیات کا لفظ استعمال کیا ہے، میں نے مجبوراً ترجمہ میں معجزہ کا لفظ اختیار کیا ہے۔ لیکن اس سے معجزہ مصطلحۂ متکلمین نہیں سمجھنا چاہئے، فصل کے شروع میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش نظر رکھئے (مترجم)

سا ری زمین میں غبار ہو جائے گی اور تمام ملک مصر میں آدمی اور چار پایوں کے بدن پر پھوڑے اور پھپھولے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے بھٹی کی راکھ لی اور فرعون کے آگے کھڑے ہوئے اور موسیٰ نے اسے آسمان کی طرف پھینک دیا اور وہیں آدمی اور بہائم کے بدن پر پھوڑے اور پھپھولے پیدا ہو گئے اور جادوگر پھوڑوں کے سبب سے موسیٰ کے آگے کھڑے نہ رہ سکے، کہ جادوگروں اور سارے مصریوں پر پھوڑے تھے۔"

بعینہ اسی قسم کا اثر اصحاب فیل پر ہوا۔ حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ "جس کو پتھر لگے، اس کو چیچک نمودار ہو گئی" حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ سے بھی اسی مطلب کی روایات ہیں۔ لیکن مصریوں کے پھپھولے مہلک نہ تھے اور اصحاب فیل کو جو چیچک نکلی اس نے اکثروں کا تو وہیں خاتمہ کر دیا اور جو بچ رہے وہ بھی بھاگتے ہوئے راستوں میں ختم ہو گئے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے "وہ واپسی میں راستوں اور گھاٹوں پر گرتے اور مرتے رہے۔"

۳۔ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آٹھویں معجزہ سے بھی

یک گونہ مشابہت ہے، کیونکہ وہ بیکر ہاتھیوں اور مقتولوں کی لاشوں کو کھانے کے لئے خدا نے سمندر کی جانب سے بڑی بڑی چڑیوں کے جھنڈ بھیجے۔ اگر یہ لاشیں پڑی رہتیں تو ایک مدت تک کے لئے مکہ ناقابل سکونت ہو جاتا۔

سفر خروج (ب ۱۰: ۱۲-۱۹) میں حضرت موسیٰ کا معجزہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ ٹڈیوں کے لئے مصر کی زمین پر بڑھا، تاکہ وہ ملک مصر پر آئیں اور ہر ایک سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہیں کھالیں، پس موسیٰ نے زمین پر اپنا عصا اٹھایا اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی، جب صبح ہوئی تو پروا آندھی ٹڈیاں لائی اور ٹڈیاں تمام مصر پر آئیں اور مصر کے تمام اطراف پر بیٹھیں اور ایسی بے شمار تھیں کہ ان سے پیشتر ایسی ٹڈیاں نہ آئی تھیں، نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کہ سارا روئے زمین ان سے چھپ گیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انھوں نے اس زمین کی ہر ایک سبزی اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے، چاٹ لیا اور تمام ملک مصر میں کسی درخت پر اور میدان کی گھاس میں سبزی نہ چھوڑی۔

تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو جلد بلایا اور کہا کہ میں خداوند تمہارے خدا کا اور تمہارا گنہگار ہوں سو اب میں تمہاری منت کرتا ہوں فقط اس مرتبہ میرا گناہ بخشو، اور خداوند اپنے خدا سے شفاعت کرو، کہ فقط اسی موت کو مجھ سے دور کر دے، چنانچہ وہ فرعون پاس سے نکل گیا، اور خداوند سے شفاعت کی اور خداوند نے پچھوا آندھی بھیجی جو ٹڈیوں کو لے گئی اور دریائے قلزم میں ڈال دیا۔"

ٹڈیوں کی طرح چڑیاں بھی سمندر کی جانب سے آئی تھیں۔ ان کا آنا بھی ایک بے نظیر واقعہ تھا۔ کثرت میں بالکل ٹڈی دل کی طرح تھیں، جس طرح ٹڈیوں نے اولوں کی تباہ کی ہوئی سبزی اور میووں کو صاف کر دیا، اسی طرح ان چڑیوں نے ابرہہ کے سنگسار کردہ لشکر کو جو بالکل بھس کی طرح ہو گیا تھا، صاف کیا، اگلی فصل میں ہم اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

واقعہ طیر

۹۔ ہم نے کہا ہے کہ چڑیاں مکہ کو مقتولین کی لاشوں سے صاف کرنے کے لئے آئی تھیں۔ حالانکہ مشہور روایت یہ ہے کہ وہ اصحاب فیل کو سنگسار کرنے

کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ اسلئے ضرورت ہے کہ روایات پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

روایات پر غور کرنے سے ہمارے سامنے دو فریق آتے ہیں اور دونوں واقعہ کی تصویر دو مختلف طریقوں سے کھینچتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینے سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں کے مختلف فیہ پہلوؤں کو الگ الگ دیکھ لیا جائے

ایک فریق کے بیانات یہ ہیں۔

۱۔ چڑیاں درندہ قسم کی اور بڑے قد کی تھیں۔
۲۔ ان کا رنگ اور صورت اس اس طرح کی تھی۔
۳۔ انھوں نے اصحاب فیل کی لاشوں کو کھایا۔
۴۔ اصحاب فیل پر ہر سمت سے پتھر آئے۔
۵۔ پتھروں کے لگنے سے ان کو چیچک ہو گئی۔
۶۔ ان کی ہلاکت ایک ہی جگہ نہیں ہوئی، بلکہ بھاگتے وقت بہت سے راستوں میں مرے۔

دوسرے فریق کے بیانات یہ ہیں۔

۱۔ چڑیاں اصحاب فیل کو پتھر مارتی تھیں۔

۲۔ پتھر ان کی چونچوں اور چنگلوں میں ہوتے تھے۔

۳۔ یہ پتھر سواروں کے جسموں سے گذر کر ہاتھیوں کے جسموں میں گھس جاتے تھے۔

۴۔ جہاں تھے وہیں ڈھیر ہو گئے۔

۵۔ سیلاب آیا اور مقتولین کی لاشوں کو بہا لے گیا۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھو۔

اب ہم دونوں قسم کی روایتیں تفسیر ابن جریر سے نقل کرتے ہیں، ہم نے صرف اسی کتاب پر اکتفا کیا اور قصداً ایسی کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے جن میں بغیر کسی جرح و تنقید کے ضعیف و موضوع روایات بھر دی گئی ہیں۔

۱۔ عکرمہ[۱] سے "طیرا ابابیل" کے بارہ میں روایت ہے کہ "یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں، سمندر کی سمت سے آئی تھیں، ان کے سر درندوں کے سر کی طرح تھے۔

۲۔ محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے طیرا ابابیل کے

---

[۱] مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے تمام روایتیں بقید سند نقل کی ہیں۔ میں نے بقصد اختصار سند حذف کر دی ہے۔ (مترجم)

بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد چڑیاں ہیں۔ ان کے چڑیوں کی طرح کے سونڈ اور کتے کے پنجوں کے مانند چنگل تھے۔

یہ دوسری روایت حضرت ابن عباس سے متعدد طرق سے مروی ہے۔ اس میں ایک بات قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے ان چڑیوں کی چونچوں کے لئے "خرطوم" (سونڈ) کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جو شکاری چڑیوں کے لئے مستعمل ہے؛ چنانچہ امرؤ القیس کا شعر ہے۔

کانہا لقوۃ طلوب   کان خرطومہا منشال

وہ اونٹنی جھپٹنے والے عقاب کی طرح ہے   جس کی چونچ کرچھے کے مانند ہے

۳۔ سعید بن جبیر نے "طیرا ابابیل" کے بارہ میں فرمایا:- یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں اور زرد گوں چونچوں سے ان کا گوشت کھاتی تھیں۔

دیکھو عکرمہ اور ابن عباس کی روایت سے صاف واضح ہے کہ یہ چڑیاں بڑے قد کی شکاری چڑیوں کی قسم کی تھیں مثلاً گدھ وغیرہ، ابن جبیر والی روایت میں تصریح ہے کہ وہ ان کی لاشوں کو کھاتی تھیں۔ ان روایات میں چڑیوں کے پتھر مارنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اسکے بعد ہم کو دو روایتیں ملتی ہیں جو قتادہ اور عبید بن عمیر سے مروی ہیں

جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ چڑیاں چونچوں اور چنگلوں میں پتھر لئے ہوئے ہوتی تھیں، ان روایات میں، چڑیوں کے از قسم جوارح ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ان کے علاوہ ایسی روایتیں بھی ہیں، جن میں یہ دونوں قسم کی باتیں یکجا ہوگئی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ راویوں کی بد احتیاطی ہے، انھوں نے غلطی سے دونوں قسم کی روایتوں میں خلط مبحث کر دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہاں مختلف روایتیں باہم گڈمڈ ہوگئی ہیں۔"

اب ان دونوں قسم کی روایات پر غور کرنا چاہئے، جن لوگوں نے چڑیوں کی شکل وصورت، ان کا رنگ، ان کی چونچوں کی زرد گونی، ان کا لاشوں پر گرنا، سب کچھ بیان کیا ہے، ظاہر ہے کہ ان کا بیان عینی شہادت پر مبنی ہوگا۔ باقی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ چونچوں اور چنگلوں میں پتھر اٹھائے ہوئے تھیں ان کی بابت زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ یا تو انھوں نے اوپر سے پتھر برستے ہوئے دیکھے اور دور سے یہ گمان کر لیا کہ یہ چڑیاں پھینک رہی ہیں یا ترمیہم کی ضمیر کا مرجع طیراً کو سمجھا اور پھر اصل واقعہ کی تحقیق کئے بغیر آیت کی جو تاویل ذہن میں آئی اسی سانچہ میں قصہ کو بھی ڈھال لیا۔ اس کے بعد جب یہ سوال سامنے

آیا کہ ہاتھیوں اور مقتولین کی متعفن لاشیں جن سے تمام وادی مکہ اٹ گئی تھی، کس طرح دور کی گئیں؟ اس کا جواب یہ دیدیا کہ اللہ تعالیٰ نے سیلاب بھیجا وہ سب بہالے گیا۔ حالانکہ اس جواب کے بعد یہ غور کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ جو بے پناہ سیلاب ان ہاتھیوں اور اتنے بے شمار مقتولین کی لاشیں بہالے گیا اس کے زد سے وادیٔ مکہ کے باشندے کیسے بچ گئے؟ بہرحال یہ ایک رائے ہے، اسکی بنیاد مشاہدہ اور واقفیت پر نہیں ہے۔

آگے بڑھ کر ان لوگوں کو ایک اور اشکال بھی پیش آیا، وہ یہ کہ چڑیوں کے چنگلوں اور چونچوں سے جو پتھر گرتے رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے سیدھے گرتے رہے ہونگے پھر ان ہاتھیوں کو کیسے لگے ہوں گے، جو ہودجوں اور سواروں سے بالکل ڈھکے ہوئے تھے؟ اس کا جواب یہ دیدیا کہ یہ پتھر سواروں کے جسموں سے گذر کر ہاتھیوں کے جسموں تک پہنچ جاتے تھے۔ واقعہ کی اس حد تک پہنچ جانے کے بعد ان کو مجبوراً یہ بھی فرض کر لینا پڑا کہ ابرہہ کی پوری فوج عین موقع ہی پر تباہ ہوگئی اور یہ بربادی صرف پتھروں کے ذریعہ ہوئی۔ لیکن فریق اول کے بیان میں تصریح ہے کہ جن کو پتھر لگے وہ چیچک میں مبتلا ہو گئے اور سب فوراً نہیں ہلاک ہو گئے بلکہ نہایت بدحواسی کے ساتھ بھاگے اور راستوں میں ہر جگہ نہایت

بیکسی کے عالم میں جانیں دیں۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوسرے فریق کی رائے تمام تر اس فرض پر مبنی ہے کہ رمی چڑیوں کی جانب سے ہوئی، اس فرض کے بعد، واقعہ کا پورا سلسلہ آپ سے آپ اسی سانچہ میں ڈھل گیا۔ یہ رائے ذاتی مشاہدہ یا مشاہدہ کرنے والوں کے بیانات پر مبنی نہیں ہے۔

ذیل میں ہم ان لوگوں کے اقوال نقل کرتے ہیں جو موقع پر موجود تھے اور تمام حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔

کلام عرب کی شہادت کہ رمی آسمان سے اور ہوا ہوئی

۱۔ چھٹی فصل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس سورہ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس واقعہ سے اچھی طرح واقف تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے۔ اس لئے قرآن مجید نے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ جس طرح پچھلی قوموں کے مشہور و معروف واقعات یاد دلائے تھے، اسی طرح اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ اب ہم اشعار عرب سے اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ واقعہ کے عینی شاہد ہیں، اس لئے ان کے بیانات سے واقعہ کی اصلی صورت بھی سامنے آئے گی۔ یہ اشعار سیرت ابن ہشام اور بعض دوسری کتابوں میں مذکور ہیں۔

ابو قیس کہتا ہے :۔

ومن صنعہ یوم فیل الحبوش اذ کلما بعثوہ رزم

اور اہل حبشہ کے ہاتھی والے دن، اسکے عجیب کرشموں میں یہ ہے کہ جتنا اسکو اٹھاتے تھے اتنا ہی وہ بیٹھا جاتا تھا۔

محاجنہم تحت اقرابہ وقد کلموا انفہ فانخرم

انکے آنکس اسکی کمر اور پیٹ کے نیچے زخمی کر رہے تھے اور انہوں نے اسکی سونڈ زخمی کر ڈالی تھی۔

وقد جعلوا سوطہ مغولا اذا یمموہ قفاہ کلم

انھوں نے گپتی کا کوڑا بنایا تھا۔ جب اس سے مارتے تھے اس کے سر کو زخمی کر دیتی تھی۔

فارسل من ربہم حاصب یلفہم مثل لف القزم

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر "حاصب" چلی جو خس و خاشاک کیطرح ان کو لپیٹ لیتی تھی۔

صیفی بن عامر یعنی ابو قیس بن اسلت جاہلی یثربی کہتا ہے۔

قوموا فصلوا ربکم وتعوذوا بارکان ھذا البیت بین الاخاشب

کھڑے ہو کر اپنے رب سے دعا مانگو اور اس گھر کی پناہ لو جو پہاڑیوں کے درمیان ہے۔

فعندکم منہ بلاء مصدق غداۃ ابی یکسوم ھادی الکتائب

کیونکہ خدا کیطرف سے تمہیر ایسا انعام ہوا جس سے تمام عدو نکی تصدیق ہو گئی۔ ابو یکسوم (ابرہہ) کے حملہ کے دن .. جبکہ دشمنوں نے گھیر لیا تھا

فلما اجاز وابطن نعمان هم — جنوح الآل بين ساف وحاجب

جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے "ساف" اور "حاجب" کے درمیان نمودار ہو کر

فولوا سراعا ما دمین ولم یوب — الی اهله ملجیش غیر عصائب

وہ نامراد الٹے پاؤں بھاگ گئے اور فوج میں سے چند مختصر جماعتوں کے سوا کسی کو اپنے اہل و عیال سے ملنا نصیب

طفیل غنوی جاہلی کہتا ہے۔

ترعی مذ الف وہی اطاعل — بالجزع حیث عصی اصحابہ الفیل

ابو الصلت یعنی ابو امیہ بن ابی الصلت، قبیلہ ثقیف کا جاہلی شاعر، طائف کا باشندہ

ہے، ثقیف، لات اور غبغب کو پوجتے تھے، ان کا ایک خاص معبد بھی تھا جس میں باقاعدہ

کلید برداری وغیرہ کے مناصب تھے، اس معبد کی وجہ سے ثقیف اور قریش میں ایک

حریفانہ چشمک تھی، وہ کہتا ہے۔

ان ایات ربنا بینات — لایماری بهن الا الکفور

ہمارے رب کی نشانیاں بالکل واضح ہیں، صرف کافر ہی انکا انکار کر سکتے ہیں۔

حبس الفیل بالمغمس حتی — ظل یحبو کانہ معقور

اس نے ہاتھی کو مغمس میں روک دیا یہاں تک کہ وہ گھٹنوں کے بل اس طرح چلتا تھا جس طرح

وہ اونٹنی جس کی کوچیں کاٹ دی گئی ہوں۔

واضعا خلفہ الحوار کما فطر صخر من کبکب محدورا

اور اسکے پیچھے اس کا بچہ تھا جیسے کوہ کبکب سے کوئی چٹان تراش لی گئی ہو۔

کسی نے ابرہہ کو مخاطب کرکے کہا ہے۔

این الفرار والالٰہ الطالب والاشرم المغلوب غیر الغالب

اب کہاں بھاگتے ہو۔ خدا تعاقب میں ہے۔ اشرم مغلوب ہوگا۔ غالب ہوگا

عبدالمطلب نے کوہ حرا پر چڑھ کر کہا:۔

لاھم ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک

اے خدا آدمی اپنے اہل کی حفاظت کرتا ہے۔ تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر

لا یغلبن صلیبہم ومحالہم ابدا محالک

ان کی صلیب اور قوت تیری قوت پر غالب نہ ہو۔

ان کنت تارکہم وقبلتنا فامر مابدالک

اگر تو ہماری قبلہ کو ان کے زیرنگیں کرنا چاہتا ہے تو وہی کر جو تیری مرضی ہو۔

نفیل بن حبیب خثعمی جاہلی جو موقع پر موجود تھا کہتا ہے۔

الا ردی جمالک یا ردینا نعمنا کم مع الاصباح عینا

اے ردینہ اپنے اونٹوں کو واپس لا۔ تمہارے دیدار سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

فانك لو رأيت ولن تريه   الى جنب المحصب ما رأينا

اگر تو دیکھتی اور اب ہرگز نہیں دیکھ سکتی جو محصب کے پہلو میں ہم نے دیکھا۔

اکل الناس يسأل عن نفيل   كان علىّ للحبشان دينا

ہر شخص نفیل ہی کو پوچھتا ہے۔ گویا حبشیوں کا میں نے قرض کھایا ہے۔

حمدت الله اذ عاينت طيرا   وحصب حجارة تلقى علينا

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب چڑیوں کو دیکھا اور ہمارے اوپر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔

مغیرہ بن عبد اللہ المخزومی نے کہا ہے۔

انت حبست الفيل بالمغمس   حبسته كانه مكردس

تو نے مغمس میں ہاتھی کو روک دیا اس طرح گویا ایک آدمی کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا گیا ہو۔

محتبس تزهق فيه الانفس

ان اشعار کو غور سے پڑھو، یہ لوگ، جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں، چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں، لیکن یہ کہیں نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے، بلکہ اس سنگساری کو "حاصب" اور "ساف" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس لئے اب ان دونوں لفظوں کی حقیقت دریافت کرنی چاہئے۔

عربی میں "حاصب" اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکریاں اور سنگریزے لا کر پاٹ دیتی ہے اور اس بادل کو بھی کہتے ہیں جس سے اولوں اور برف کی بارش ہوتی ہے، قوم لوط کے عذاب کے متعلق قرآن میں ہے اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمۡ حَاصِبًا ہم نے ان پر حاصب بھیجی۔

مفسرین نے حاصب کے معنی ایسی تند ہوا کے لئے ہیں جو زور و شدت کی وجہ سے زمین کی کنکریاں اور سنگریزے اٹھا لیتی ہے۔ حضرت علیؓ نے خوارج سے خطاب کرکے فرمایا "اصابکم حاصب" (تم پر حاصب چلے) اہل لغت نے اس کی تفسیر یوں کی کہ تم پر عذاب الٰہی آئے، یعنی آسمان سے تم پر سنگریزوں اور کنکریوں کی بارش ہو۔

دوسرا لفظ "سافی" ہے چڑیوں کے لئے اس لفظ کا استعمال کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، سافی اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس و خاشاک اور درختوں کی خشک پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے۔ بلکہ غبار کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہے اور چڑیوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ چونچوں اور چنگلوں میں غبار نہیں اٹھا سکتیں۔

ان شعروں میں یہ بھی تصریح ہے کہ اصحاب فیل نہایت ابتری کے ساتھ بھاگے، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ پتھر انکے جسموں میں گھس جاتے تھے،

اگر ایسا ہوتا تو پھر سب وہیں سکے وہیں ڈھیر ہو جاتے، بھاگنے کی نوبت نہ آتی۔

عین اس دن اس آندھی کا اٹھنا ایک حیرت انگیز واقعہ تھا، اسلئے تمام زبانوں پر اس کا چرچا پھیل گیا، چنانچہ ساتویں فصل میں ہم ذوالرمہ کے اشعار نقل کر آئے ہیں۔ جس نے ایک حیرت انگیز واقعہ کی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور پوری تصویر کھینچدی ہے۔

الغرض تمام قرائن وحالات کی شہادت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی طرح اصحاب فیل پر بھی تند ہوا کا آسمانی عذاب بھیجا، جس نے ان پر ہر طرف سے گرد وغبار کے ساتھ کنکروں اور پتھروں کی بارش کی، یہ سب اللہ تعالیٰ کی فرستویں یا دوسرے لفظوں میں اس کی مخفی افواج کی کارفرمائی ہے۔

سورہ ذاریات اور سورہ مرسلات میں خدا نے اسی چیز کو شہادت میں پیش کیا ہے۔ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ان شاعروں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ چڑیاں ان کی لاشیں کھاتی تھیں لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ کی روایات میں کنایتًہ وصراحتًا دونوں طرح اس کا ذکر آچکا ہے، باقی رہے شعراء تو انکا عام انداز کلام اجمال وکنایہ ہے، تصریح وتفصیل نہیں۔ بعض نے مجملاً چڑیوں کے

دیکھنے کا ذکر کر دیا ہے اور اس قدر بس تھا، کیونکہ قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خوار چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم و مشہور بات تھی۔ وہ فوج کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ اصحاب رجیع کے قتل کی پیشینگوئی عمرو بن امیہ نے اسی دلیل سے کی بعض شعراء فوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو تفرس و تجربہ سے پتہ چل گیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں ملیں گی، اس لئے وہ بھی ساتھ ہو لی ہیں۔ مشہور شاعر نابغہ عمرو بن حارث غسانی اور اس کی قوم کا ذکر کرتا ہے۔

اذا ما غزوا بالجیش حلق فوقهم عصائب طیر تهتدی بعصائب

جب وہ فوج لیکر حملہ کرتے ہیں، چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کے اوپر منڈلاتے ہیں۔

تراهن خلف القوم خزرا عیونها جلوس الشیوخ فی ثیاب المرانب

قوم کے پیچھے چڑیاں بیٹھی ہوئی کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہیں جیسے پوستین اوڑھے ہوئے شیوخ بیٹھے ہوں۔

جوانح قد ایقن ان قبیله اذا ما التقی الجمعان اول غالب

وہ گرا چاہتی ہیں کیونکہ ان کو یقین ہے کہ جب دو جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوتی ہے تو اسی کا قبیلہ غالب رہتا ہے۔

اسی مضمون کو ابو نواس نے لیا ہے۔

تنتابی الطیر عدوتہ   ثقة بالشبع من جزرہ

غرض، فوج کے ساتھ چڑیوں کا محض ذکر کر دینا کافی تھا، اس تشریح کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ وہ چڑیاں لاشوں کو کھاتی تھیں، یہ بات عرب میں ایسی جانی بوجھی ہوئی تھی کہ خود بخود سمجھی جاتی تھی۔

فوج اور چڑیوں کا یہ تعلق واضح ہو جانے کے بعد تصور کرو جس وقت سیہ فام و دیو ہیکل حبشیوں اور کوہ پیکر ہاتھیوں کا یہ سیلاب ظلمت، عرب کے سپید صحرا کی طرف بڑھا ہوگا، یہ منظر کتنا خوفناک اور عجیب رہا ہوگا! ناممکن ہے کہ شکاری اور گوشت خوار چڑیاں، جن کے تجربہ و تفرس کی اتنی شہادتیں گزر چکی ہوں، اس دل بادل فوج کی روانگی کے وقت چوک جائیں۔ صحرائی افریقہ کے خوفناک اور بڑے بڑے گدھ اپنے ہولناک سروں اور آہنی چنگلوں کے ساتھ ضرور ان کے ہمرکاب رہے ہوں گے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ یہ پرند سمندر کی طرف سے آئے تھے۔

تم کہو گے یہ تو روزمرہ کا ایک معمولی اور عادی واقعہ ہوا پھر اس اہتمام و شان کے ساتھ اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، قرآن مجید میں، نوح، لوط اور عاد و ثمود کی قوموں کی بربادی کے واقعات بیان کئے

گئے ہیں، حالانکہ ان تمام قوموں کی تباہی عام اسباب ہی کے ماتحت ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ یہ واقعات اگرچہ عام اسباب و علل کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں، لیکن ان میں خدا کی رحمت و نقمت کی نہایت اہم داستانیں پنہاں ہیں۔ پھر قرآن مجید کا عام انداز تذکیر و موعظت بھی یہی ہے، وہ ہر قدم پر شب و روز کی آمد و شد، ہواؤں اور بادلوں کی گردش، شمس و قمر کے ایاب و ذہاب کا تذکرہ کرتا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے روزمرہ کے آزمائے ہوئے ضابطۂ قدرت سے الگ نہیں ہے، پس جس طرح اس نے ان واقعات و تصرفات قدرت کا حوالہ دیا ہے، اسی طرح اصحاب فیل کی بربادی کا بھی ذکر کیا کہ اس میں مکہ اور اہل مکہ کی حفاظت، ان کے دشمنوں کی سنگریزوں اور پتھروں کے ذریعہ عبرت انگیز بربادی، طیر ابابیل کے ذریعہ جوار مکہ کی تطہیر کی بے شمار نشانیاں پنہاں تھیں۔

پھر اس میں حضرت سرور عالمؐ کی ولادت کی بھی ایک عظیم الشان نشانی تھی جو اگلے صحیفوں میں مذکور ہوئی تھی، آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔

آنحضرت صلعم کے متعلق ایک اہم پیشینگوئی کی تصدیق

۱۱۔ چڑیوں کے متعلق اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید یوحنا (یحییٰ) کے

مکاشفات سے بھی ہوتی ہے انھوں نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کے پیرؤوں کے تذکرہ کے ذیل میں حضرت خاتم النبیین صلعم کا بھی ذکر کیا ہے اور آپ کے سلسلہ میں قیامت تک جو اہم واقعات پیش آئیں گے، ضمناً ان میں سے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ازانجملہ یہ بھی ہے کہ فضا کے سارے اڑنے والے پرندے خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہوں گے۔ سورۂ ماعون کی تفسیر میں ہم نے بیان کیا ہے کہ ہاشم نے یہ سنت جاری کردی تھی۔ چنانچہ ان کو "چڑیوں کا میزبان" کہا جاتا تھا۔ اب مزید تعمق سے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ حضرت یحییٰؑ کے مکاشفہ سے واقف تھے ان کیلئے اس واقعہ میں آنحضرت صلعم کے قرب ولادت کی بشارت تھی، حضرت یحییٰؑ کا مکاشفہ (۱۹ب: ۱۱-۱۹) میں یوں مذکور ہے۔

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا، اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے، جو امین اور صادق (سچا او ربرحق) کہلاتا ہے اور راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے اور اسکی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے (یعنی آپ نبی جہاد ہوں گے، نیز فتح مکہ کے وقت

آپ کے جسم پر سرخ لباس تھا) اور اس کا نام کلامِ خدا کہلاتا ہے (غالباً یہ راویوں کا اضافہ ہے تاکہ اس مکاشفہ کے مصداق حضرت عیسیٰ ہو سکیں حالانکہ بقیہ تمام باتیں ان کی زندگی سے بالکل بے جوڑ ہیں) اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور صاف مہین کتانی کپڑے پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہیں (جیسا کہ غزوۂ بدر میں واقع ہوا) اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے، (یعنی قرآن حکیم) اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا (اس میں اشارہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی حکومت نہایت مستحکم عدل کی بنیاد پر قائم ہو گی، اور کفار نیز عہد شکن اہل کتاب آپ کی عدالت میں سزا پائیں گے، چنانچہ آنحضرت صلعم کی نسبت حضرت موسیٰؑ نے بھی پیشینگوئی فرمائی ہے کہ "وہ نافرمانوں پر سخت ہو گا" اس کی کامل مثال حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا عہد خلافت ہے) اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں انگور روندے گا (چنانچہ فتح مکہ کے دن کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر آپ نے خطبہ دیا: اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنے وعدے کو پورا کیا، اپنے بندہ کی مدد فرمائی

اور یکہ و تنہا دشمن کے تمام جتھوں کو شکست دی۔ سن لو! تمام خاندانی استحقاق اور مال اور خون کے تمام مطالبات میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں صرف دو مستثنیٰ ہیں، خانہ کعبہ کی کلید برداری، اور حجاج کو پانی پلانے کی خدمت اسی طرح عرفہ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا، سن رکھو! جاہلیت کی ہر بات میرے ان قدموں کے نیچے روندی گئی (مسلم، پیشینگوئی کے اس حصہ کی شرح بہت طویل ہے یہاں محل تفصیل نہیں) اور اس کی پوشاک پر یہ نام لکھا ہوا ہے، بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند، (غالباً اس مقام پر راس الخلفاء، اور سید السادات وغیرہ کے ہم معنی الفاظ ہوں گے) پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑے ہوئے دیکھا اور اس نے بڑی آواز سے چلا کر آسمان میں کے سارے اُڑنے والے پرندوں سے کہا کہ آؤ، خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ، تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت اور فوجی سرداروں کا گوشت اور زورآوروں کا گوشت، اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت اور سارے آدمیوں کا گوشت کھاؤ خواہ آزاد ہوں خواہ غلام، خواہ چھوٹے ہوں خواہ بڑے"

اس کے بعد جو حالات بیان ہوئے ہیں، وہ بھی نبی امی صلعم کے حالات سے پوری

مطابقت رکھتے ہیں لیکن زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے پیشینگوئی کو شروع سے نقل کیا ہے، کہ تطبیق حالات میں کسی کو کوئی شبہہ نہ ہو، دیکھو اجب آنحضرت صلعم کے ظہور کا وقت قریب آیا، اللہ تعالیٰ نے آسمان کے اڑنے والے پرندوں کو اپنی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی، ممکن ہے کہ تم کہو کہ یہ پیشینگوئی اخیر عہد رسالت سے متعلق ہے۔ یہ صحیح ہے۔ ہم کو اس سے انکار نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک مثال شروع میں دکھا دی تاکہ آپکے محبوب شہر پر حملہ کے وقت آپکے دشمنوں کی بربادی کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس کے متعلق آپ کو پورا اطمینان قلب ہو جائے، نیز منکرین کو فی الجملہ تنبیہ ہو جائے، جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ	اور اس بڑے عذاب سے پہلے ہم ان کو
الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَ	چھوٹے عذاب چکھائیں گے تاکہ وہ
كْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ٥	ہماری طرف رجوع ہوں۔

تاویل میں غلط فہمی کے اسباب

۹۔ اس واقعہ کے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں جو مشہور ہو گئی تھیں، وہی صحیح تاویل کے لئے حجاب بن گئیں۔ اب کہ یہ تمام پردے ہٹ چکے ہیں ضروری ہے کہ

چند لفظوں میں اس شہرت کے اسباب نیز بعض دوسرے وجوہ کی طرف، جو غلط فہمی کے باعث ہوئے، اشارہ کردیا جائے۔ ہر چیز کی طرح غلط فہمیوں کے بھی اسباب ہوتے ہیں اور جب تک ان کو کھول کر بیان نہ کردیا جائے، اصل حقیقت پوری طرح آشکارا نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس کے سات اسباب ہیں۔

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ اس سورہ میں خطاب آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن ترمیہم "(تم ان کو پتھر مارتے تھے)" کا لفظ اس تاویل سے ابا کرتا تھا کیونکہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلعم پتھر مارنے والوں میں شریک نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اصل تاویل سے ہٹ کر دوسری راہوں میں نکل گئے۔ ہم فصل اول میں بیان کر آئے ہیں کہ یہاں خطاب آنحضرت صلعم کی طرف نہیں ہے، بلکہ افراد اہل مکہ کی طرف ہے اور ترمیہم کا لفظ "علیہم" کی ضمیر مجرور سے یا تو حال پڑا ہوا ہے یا مستقل جملہ مستانفہ ہے۔ حال کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ "اے مخاطب دیکھ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں بھیجیں اور حال یہ تھا کہ تو ان پر پتھر پھینکتا تھا"۔ استیناف کی شکل میں یہ معنی ہوں گے کہ "تم ان پر پتھر پھینکتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا"۔ ہر چند دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے، لیکن دونوں اسلوبوں میں ایک لطیف فرق ہے۔ حال کی شکل میں [illegible] دونوں کے فعل ایک ساتھ [illegible] اور ان کی سرعت ہلاکت کی

طرف اشارہ ہوگا اور استیناف میں نتیجہ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ قریش کی سنگباری سے ان کا بھس کی طرح ہوجانا ایک بالکل غیر متوقع بات ہے، جو لوگ عربی زبان کے اسالیب و قواعد سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں، ممکن ہے، ان دونوں ترکیبوں کو نحو کے خلاف سمجھیں۔ ان کے اطمینان کے لئے ذیل میں مزید تفصیل آتی ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ حال فاعل یا مفعول کی ہیئت ظاہر کرتا ہے اور "علیھم" کی ضمیر مجرور نہ فاعل ہے نہ مفعول۔ نحویوں کا مذہب یہ ہے کہ حال کسی چیز کی ہیئت حدوث امر کے وقت بیان کرتا ہے اور حدوث کی تعبیر فعل سے ہوتی ہے۔ اسلئے جب کبھی وہ فاعل یا مفعول کے علاوہ کسی چیز سے حال پڑا ہوا پاتے ہیں تو مختلف قسم کے مقدرات و محذوفات ڈھونڈھنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ مجرور سے حال پڑنا عربی زبان میں نہایت معروف ہے۔ قرآن مجید اور کلام عرب میں اسکی بکثرت مثالیں ہیں۔

سورۂ ق میں ہے۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ	جس دن کہ زمین ان کے اوپر سے
سِرَاعًا (ق - ۴۴)	کھل جائیگی اور حال یہ ہوگا کہ وہ
....	نکلنے میں جلدی کرتے ہوں گے۔

یہاں یہ لفظ "سراعا" عنہم کی ضمیر مجرور سے حال واقع ہے۔

امرا القیس اپنے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے۔

فلما اجن الشمس عنی غیادھا　　نزلت الیہ قائما بالحضیض

جب آفتاب غروب ہو گیا میں اتر کے اسکے پاس آیا در حال یہ تھا کہ وہ ہموار زمین میں کھڑا تھا

وایضاً

کان سراتہ لدی البیت قائما　　مداک عروس وصلایۃ حنظل

جب وہ گھوڑا گھر کے باہر کھڑا ہوتا ہے اسکی پیٹھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسی دولہن کو سہاگ بھری میں پیسنے کی سل یا اندراین کے پھل توڑنے کا چوڑا پتھر۔

اعشی کہتا ہے۔

وقیا می علیہ غیر مضیع　　قائما بالغدو والاصال

اور صبح و شام مستعدی کے ساتھ میری طرف سے اس کی دیکھ بھال ضایع نہ ہو گی

لبید نے کہا ہے۔

باتت واسبل واکف من دیمۃ　　یروی الخمائل دائما تسجامھا

اور رات ایسی بسر کی کہ وہ جھڑی جو درختوں کی زمینوں اور گھاس والی تھلوں کو تر و تازہ کرتی برابر ہو رہی

نابغہ بنی جعدہ کا شعر ہے۔

تلألأ کالشعری العبور توقدت　　وکان عماء دونہا فتحسرا

وہ چمکا جیسے شعری عبور ابر سے نکل کر چمک گیا ہو۔

وایضاً

وھنھنہ حتی لبست مفاضۃ   مضاعفۃ کالنھی ریح واَمطرا

میں نے اسکو روکا یہاں تک کہ ایک ڈھیلی ڈھالی زرہ پہنی جس میں اس تالاب کی سی لہریں تھیں جس پر ہوا چل گئی ہو اور پانی برس گیا ہو۔

ابوذویب ہذلی کہتا ہے۔

ولیاتین علیک یوم مرۃ   یبکی علیک مقنعا لا تسمع

تم پر ایک دن ایسا ضرور آئیگا جب تم کو دفن کر کے تم پر ماتم کیا جائیگا اور تم کچھ سن نہ سکو گے۔

یہ چند مثالیں کافی ہیں اس لئے بس کرتا ہوں، ورنہ کلام عرب میں اس کے شواہد بکثرت ہیں۔

۳۔ "ترمیھم" سے استیناف ماننے کی صورت میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہاں مفہوم کلام کا تقاضا یہ تھا کہ ماضی کا صیغہ استعمال ہوتا، حالانکہ "ترمیھم" مضارع ہے۔ یہ شبہ بجا ہے لیکن ترمیھم اصل میں کنت ترمیھم ہے۔ عربی میں مضارع سے پہلے افعال ناقصہ کے حذف کر دینے کا قاعدہ نہایت معروف ہے اور اس کے مخصوص مواقع ہیں جن میں حذف زیادہ اولی ہے۔ یہ جگہ اس بحث کے لئے موزوں نہیں۔ "لتا سبہا الا سما البرسیۃ"

میں اس کو مفصل لکھ چکا ہوں۔ اس لئے قرآن مجید اور کلام عرب کی چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَسَخَّرَنَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ	اور خداوند نے ان پر سات رات
وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى	اور آٹھ دن اکھاڑ پھینکنے والی آندھی
الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ	مسلط رکھی، پس اے مخاطب اگر
أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ	تو وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ لوگ اس طرح
....	پڑے ہوئے ہیں جیسے کھوکھلی کھجوروں
....	کے بوٹے۔

متمم بن نویرہ کا شعر ہے۔

تقول ابنة العمری مالك بعد ما ارك قد يما ناعم الوجه افرعا

عمری کی بیٹی کہتی ہے تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے میں تمھیں نہایت ہشاش بشاش اور آراستہ زلفوں والا دیکھتی تھی۔

خداش بن زہیر بن ربیعہ کہتا ہے۔

فقفار وقد ترعی بها ام رافع مذانبها بين الاسلة والصخر

اب چٹیل میدان ہے۔ حالانکہ وہاں ام رافع وادیوں اور پہاڑیوں کے درمیان

پانی بہنے کی جگہوں پر اونٹ چرایا کرتی تھی۔

اعشیٰ بکر بن وائل کہتا ہے۔

فلئن شطّ بی المزار لقد اضحی قلیل الهموم ناعم بال

اب اگر فراق کی گھڑیاں جھیل رہا ہوں تو کچھ افسوس نہیں۔ وہ بھی دن تھے

جب میں بالکل بے غم اور ہشاش بشاش رہتا تھا۔

قطامی کہتا ہے۔

کانت منازل منا قد نحل بها حتی تغیر دهر خائن خبل

یہ سب ہماری منزلیں تھیں، جن میں ہم اترتے تھے یہاں تک کہ گردش روزگار نے تمام

نقشہ بدل دیا۔

حطیئہ کا شعر ہے

ترکت المیاه من تمیم بلاقعا علی قد تری منهم حلولا کراکرا

تو نے تمیم کے تمام چشمے ان سے خالی کرائے حالانکہ اس سے پہلے وہاں ان کی بڑی جمعیت

مقیم تھی۔

اس لئے ترمیم کو خواہ حال، یا استیناف دونوں صورتوں میں سے کسی میں

بھی کوئی قباحت نہیں ہے اور جب دونوں شکلوں میں، معناً کوئی فرق نہیں پیدا

ہوتا تو کچھ حرج نہیں اگر دونوں احتمالات باقی رکھے جائیں۔

۴۔ چڑیوں کا پتھر مارنا ایک اچنبھے اور حیرت کی بات تھی۔ اس طرح کی بات سننے اور ماننے کے لئے عوام ہمیشہ گوش برآواز رہتے ہیں۔ زبان سے نکلی اور افسانہ بزم و انجمن ہوئی۔ پھر ایسی باتوں پر لوگ اس جزم و یقین کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ اس کے متعلق کسی قسم کا غور و بحث، تقویٰ اور دینداری کے خلاف سمجھنے لگتے ہیں۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ معجزہ کے لئے ندرت اور اعجوبہ پن، کوئی لازمی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کے امثال و نظائر پر قیاس کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ حضرت موسیٰ نے مٹھی بھر راکھ اپنے ہاتھوں سے اڑا دی اور آنحضرت صلعم نے مٹھی بھر کنکری کفار کی چہروں پر اپنے دست مبارک سے پھینکی۔ بظاہر یہ عادی واقعات ہیں، تاہم دیکھو یہ دونوں نہایت عظیم الشان معجزے ہیں، ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ خوارق و معجزات اسباب و علل کی آڑ سے نمودار ہوتے ہیں۔

۵۔ بعض لوگ، جو شریک واقعہ تھے، انھوں نے چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ اس سے بعض سننے والوں کو گمان ہوا کہ یہ پتھر چڑیوں ہی نے پھینکے۔ اور ممکن ہے کہ بعض دیکھنے والوں کو بھی یہ شبہ ہوا ہو اور انھوں نے، اپنے خیال کے مطابق، واقعہ کو بیان کر دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا عذر واضح ہے۔

رمی کے جو نتائج ظہور میں آئے وہ عربوں کی رمی کے اعتبار سے بہت بڑھ کر تھے۔ ابرہہ کی پوری فوج کا بھس کی طرح پامال ہوجانا قریش کی سنگ اندازی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے ان لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ سنگباری آسمان سے ہو رہی ہے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو تمام فضا چڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس لئے خیال ہوا کہ ہو نہ ہو یہ انہی چڑیوں کا کرشمہ ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے یہ روایت سنی، انھوں نے آیت کو بھی اسی پر محمول کر لیا۔ حالانکہ یہ سمجھنا زیادہ صحیح تھا کہ یہ آسمانی رمی عربوں کی رمی کے پردہ میں ہوئی۔ جیسا کہ آٹھویں فصل میں گذر چکا ہے۔

۲۔ ابرہہ اور عبدالمطلب کے مابین جو واقعات پیش آئے، قصہ گویوں کی حاشیہ آرائیوں نے ان کی صورت بالکل مسخ کر دی تھی۔ اور مفسرین چونکہ قصص کے بارہ میں، زیادہ بحث و تحقیق کے عادی نہیں ہیں اس لئے انھوں نے انہی بے سر و پا باتوں پر اعتماد کر لیا۔ حالانکہ از روے روایت و درایت ان میں سے ایک بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی تھی، جب یہ بات دلوں میں بیٹھ گئی کہ اہل مکہ نے ابرہہ کی مدافعت نہیں کی، بلکہ نہایت بے حمیتی سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے، تو اس خیال کے بعد "ترمیهم" کا مخاطب اہل مکہ کو سمجھنا بالکل ناممکن ہوگیا اور صرف یہی شکل باقی رہ گئی کہ اس کا فاعل طیر کو مانا جائے۔

۷۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ لفظ "ترمیہم" "طیراً ابابیل" سے بالکل متصل ہے۔ اس قربت کی وجہ سے بھی خیال ہوا کہ ضمیر فاعل طیر ہی کی طرف راجع ہوتی ہے۔ اس ظاہر اور متبادر مفہوم کو نظر و تامل کے بعد ہی چھوڑنا ممکن تھا۔ اور آدمی تامل اس جگہ کرتا ہے جہاں کوئی ظاہری اشکال ہو۔ یہاں کوئی ظاہری اشکال نہیں تھا۔ اس لئے وہی تاویل چل گئی حالانکہ کامل غور و فکر کے بعد اس کی غلطیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں، واللہ اعلم۔

سنگسار کرنا لعنت ہے

۱۳۔ دشمن کو سنگسار کرنا یا اس کے منہ پر خاک جھونکنا اظہار لعنت اور بد دعا کا ایک طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر میں جب آنحضرت صلعم نے کفار کی طرف کنکریاں پھینکیں، فرمایا "شاھت الوجوہ" (خدایا یہ چہرے مسخ ہو جائیں) اسی طرح لعنت کے مواقع پر "قبح اللہ وجھك" کہتے ہیں۔ عربی میں محاورہ ہے بینھم قذیفی (انہیں آپس میں گالی گلوچ اور سنگ اندازی ہوئی) اسی وجہ سے عفیف عورتوں پر تہمت لگانے کے لئے عربی میں "قذف" کا لفظ بجز خود لعنت کا مفہوم بھی "رمی" سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کا اصلی مفہوم ذلت سے

دھتکارنا ہے، جس طرح تم کتے کو پتھر مار کر دور کرتے ہو۔ سنگسار کرنا قدیم زمانہ سے اظہار لعنت کا طریقہ ہے۔ بنی اسرائیل کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ سموئیل ۲ ب ۱۶: ۵۔۱۴ میں ہے۔

پھر وہاں سے داؤد بادشاہ بحوریم میں آیا اور وہاں سے ساول (طالوت) کے گھر کے لوگوں میں سے ایک شخص جس کا نام سمعی بن جیرا تھا نکلا لعنت کرتے ہوئے چلا جاتا تھا اور اس نے داؤد پر اور داؤد بادشاہ کے سارے خادموں پر پتھر پھینکے، اور اس وقت سارے بہادر اور سب لوگ اسکے دہنے اور بائیں ہاتھ تھے، اور سمعی لعنت کرتے ہوئے یوں کہتا تھا دور ہو! دور ہو! اے خونی مرد، اے خبیث خداوند نے ساول کے گھر کے سارے خون کو کہ جس کے عوض تو بادشاہ ہوا، تجھ پر پھیرا اور خداوند نے تیری سلطنت تیرے بیٹے ابی سلوم کے ہاتھ دی اور دیکھ تو اپنی بدی میں گرفتار ہے اسلئے کہ تو خونی مرد ہے تب ضرویاہ کے بیٹے ابیشے نے بادشاہ کو کہا یہ مرا ہوا کتا کاہے کو میرے خداوند بادشاہ پر لعنت کرے حکم ہو تو میں جاؤں اور اس کا سر اڑا دوں، بادشاہ نے کہا اے بنی ضرویاہ مجھ کو تم سے

کیا کام؟ اسے لعنت کرنے دو، کہ خداوند نے اسے کہا ہے کہ داؤد پر لعنت کرے،
پس کون کہہ سکتا ہے کہ تو نے کیوں ایسا کیا؟ اور داؤد نے ابیشے اور اپنے
سب چاکروں کو کہا دیکھو میرا بیٹا جو میری صلب سے پیدا ہوا میری جان
کا طالب ہے، پس اب یہ بنیمینی کیا کچھ نہ کرے گا: اسے چھوڑ دو اور لعنت
کرنے دو کہ خداوند نے اسے کہا ہے شاید کہ خداوند میرے دکھ پر نظر کرے
اور خداوند آج کے دن اس کی لعنت کے بدلے میں مجھ سے نیکی کرے
اور جس وقت داؤد اور اس کے لوگ راہ میں چلے جاتے تھے تو سمعی
پہاڑ کی طرف اسکے برابر گذرتا تھا، اور لعنت کرتا تھا اور اس کی طرف
پتھر مارتا تھا اور خاک پھینکتا تھا اور بادشاہ اور اس کے سارے
ہمراہی تھکے ہوئے آئے اور وہاں انھوں نے دم لیا۔"

اس کے اول اور آخیر حصہ پر غور کرو۔ ہمارے دعویٰ کی نہایت واضح
دلیل پاؤ گے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کے ساتھ پیش آیا
مربع قیظی ایک اندھا منافق تھا۔ آنحضرت صلعم صحابہ رضؓ کی ایک جماعت کے ساتھ احد
کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ جب اسکے مکان کے پاس پہنچے اور اس نے کچھ

آہٹ پائی، اُٹھ کر ان لوگوں کی طرف خاک پھینکنے لگا۔ بعض لوگ جھپٹے کہ سر قلم کر دیں۔ لیکن آپ نے روک دیا، کہ ایسا نہ کرو، یہ آنکھوں کا اندھا دل کا بھی اندھا ہے، اور آگے بڑھ گئے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رجم کو بدترین سزا قرار دیا اور صرف بدترین جرائم کے لئے مخصوص فرمایا۔ توراۃ میں والدین کی نافرمانی اور خیانت کی سزا رجم ہے تاکہ سزا کے ساتھ لعنت بھی ہو۔ لوط کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے رجم کی سزا دی۔ اسی طرح اصحاب فیل کو سنگسار کیا کہ سزا اور لعنت دونوں ہو۔ یہ لوگ نصرانیت کے مدعی تھے، اس لئے اس بنائے ابراہیمی کی حرمت ان پر فرض تھی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ	ان لوگوں سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا
اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ	ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر کو
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ	روکیں اور ان کی بربادی کے درپے
مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا	ہوں ان کے لئے جائز نہ تھا کہ ان میں
اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۥ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا	داخل ہوتے مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کیلئے
خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	دنیا میں رسوائی اور آخرت میں

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ — دردناک عذاب ہے۔

بدر میں کفار کو بھی سنگسار کیا گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ شیطان کی صفت رجیم ہے۔ کیونکہ وہ سب سے بڑا ملعون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی کی وجہ سے اس کو جنت سے نکال دیا اور فرمایا۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ — تو جنت سے نکل، دور ہو، تو مردود

وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى — ہے، تجھ پر روز جزا تک اللہ کی

يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ — پھٹکار ہے۔

یہاں اخراج اور لعنت کے بیچ میں "رجیم" کا لفظ ہے جس سے اس کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ شیطان تمام ملعونوں کا سردار ہے اسی وجہ سے لوگوں کو خیال ہوا کہ منیٰ میں "رمی جمرہ" کا تعلق شیطان ہی سے ہے اور پھر یہیں سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس کی فریب کاریوں کا قصہ پیدا ہوگیا۔ اگلی فصل میں ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

منیٰ میں رمی جمرہ کی حقیقت

۱۴- بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں رمی جمرہ واقعہ فیل کی یادگار

ہے۔ لیکن ضعیف روایات نے اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں "روایت ہے کہ مینڈھا حضرت ابراہیمؑ سے نکل کر بھاگا۔ انھوں نے اس کو سات کنکریاں ماریں اور پھر پکڑ لیا۔ اس کے بعد سے یہ رمی کی سنت قائم ہوگئی"۔ دوسری روایت ہے کہ جس وقت انھوں نے بیٹے کی قربانی کا قصد کیا، شیطان نے بہکانا چاہا، انھوں نے اس کو کنکریاں ماریں اور یہ سنت اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ مینڈھا نکل بھاگا تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے اس کو جمرہ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ اور جمرہ کبریٰ کے پاس سات سات کنکریاں ماریں۔

پھر دوسری روایت حضرت علیؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مینڈھے کو ثبیر میں ایک ببول کے درخت سے بندھا ہوا پایا۔ اس روایت کی تائید تورات سے بھی ہوتی ہے۔ توراۃ میں ہے:-

"ابراہیمؑ نے آنکھ اٹھائی اور دیکھا کہ مینڈھا سامنے جھاڑی میں دونوں سینگوں سے بندھا ہوا ہے۔ پس وہ گیا اور اس کو پکڑا"۔

بہرحال مینڈھے کے بھاگنے کی روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ ایک روایت

یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ نے جمرہ کے پاس ابلیس کو سنگسار کیا تھا۔ لیکن صحیح روایات میں سنت رمی جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اس کے متعلق کوئی بات صحیح روایات سے ثابت ہوتی تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی تھی۔ لیکن جہاں تک معلوم ہے، اسکے متعلق کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سن پائے اس کو بیان کرنے لگے۔ اس لئے ہم نے استنباط کی راہ اختیار کی۔ صحیح و ثابت سے استنباط، اس صریح سے زیادہ بہتر ہے جو ثابت نہ ہو۔ خدا نے جا بجا تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ۝ — اس میں غور کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اب ہم اپنے وجوہِ استنباط کی تفصیل کرتے ہیں۔

۱۔ حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آرہے ہیں۔ عربوں نے تمام مناسک انہی سے سیکھے۔ چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً و تفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ احرام، استلام، طواف، طیر حرم، صفا و مروہ، ہدی و نحر، زیارت عرفہ، وقوف منیٰ، ہر چیز کا تذکرہ ہے۔ تفسیر آل عمران میں ہم تمام

شواہد نقل کر چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ کلام جاہلیت میں رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے اور واقعہ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے احسان کی یادگار اور اس کی قدرت قاہرہ کی ایک عظیم الشان نشانی تھی، اسلئے اسلام نے اس کو باقی رکھا اور حج کے مراسم میں شامل ہو کر اس نے تکبیر و تہلیل کی ایک مخصوص سنت کی حیثیت حاصل کر لی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔[1]

۲۔ یہ ثابت ہے کہ اصحاب فیل پر سنگباری وہیں ہوئی تھی جہاں رمی کی سنت ادا کی جاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رمی محصب کے ایک حصہ میں ہوتی ہے

---

[1] اخرج الحاکم فی صحیحہ عن عائشۃ انہا قالت افاض رسول اللہ صلعم من آخر یومہ حین صلی الظہر ثم رجع فمکث بمنیٰ لیالی ایام التشریق یرمی الجمرۃ اذا زالت الشمس کل جمرۃ بسبع حصیات یکبر مع کل حصاۃ و یقف عند الاولی و عند الثانیۃ فیطیل القیام و یتضرع ثم یرمی الثالثۃ و لا یقف عندہا۔

آنحضرت صلعم ایام تشریق میں منیٰ میں ٹھہرے، زوال کے بعد آپ رمی جمرۃ کرتے۔ ہر جمرہ پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر فرماتے۔ جمرہ اولیٰ اور جمرہ ثانیہ کے پاس وقوف کر کے دیر تک دعا و تضرع فرماتے جمرہ ثالثہ کے پاس وقوف نہ فرماتے۔ ....

اور محصب منیٰ میں شامل ہے۔ لسان العرب میں اصمعی کا قول ہے کہ محصب وہ جگہ ہے جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ثبوت میں یہ شعر پیش کئے ہیں۔

اقام ثلاثا بالمحصب من منیٰ   ولما یبن للناعجات طریق

اس نے محصب میں، جو منیٰ میں ہے تین دن قیام کیا اور اونٹنیوں کی راہیں بھی رکی ہوئی تھیں۔

راعی کا شعر ہے:-

الم تعلمی یا الام الناس اننی   بمکۃ معروف وعند المحصب

ارذل خلائق! تجھے خبر نہیں کہ میں مکہ اور محصب ہر جگہ معروف ہوں

اس نے رمی جمرہ کے مقام کو مراد لیا ہے۔ اس کی مزید تائید عمر بن ربیعہ کے شعر سے ہوتی ہے۔

نظرت الیہا بالمحصب من منی   ولی نظر لولا التحرج عارم

میں نے اسکی طرف محصب میں، جو منی میں ہے، دیکھا۔ اور اگر مجھے اندیشہ معصیت نہ ہوتا تو میری نگاہ واپس نہ آتی۔

اس مقام کو محصب اسلئے کہتے ہیں کہ وہاں کنکریاں بہت زیادہ ہیں۔

لسان العرب میں ہے:-

"حصب الموضع کے معنی یہ ہوئے کہ وہاں چھوٹی چھوٹی کنکریاں لاکر بچھا دیں"۔ حدیث میں ہے "ان عمرؓ امر بتحصیب المسجد" حضرت عمرؓ نے مسجد میں کنکریاں بچھانے کا حکم دیا۔

الغرض یہ بالتحقیق ثابت ہے کہ اصحاب فیل پر سنگباری محصب کے پاس ہوئی نفیل جو شریک واقعہ تھا کہتا ہے۔

ردینة لو رایت ولن تریه   لدی جنب المحصب ما راینا

ردینہ کاش تو دیکھ لیتی۔ (اور اب ہرگز نہیں دیکھ سکتی) جو محصب کے پہلو میں ہم نے دیکھا

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب فیل کی بربادی کی جگہ رمی کی جگہ سے بالکل قریب تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ واقعہ وادی محسر میں پیش آیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے وادی محسر کی وجہ تسمیہ بھی یہی بیان کی ہے کہ اس مقام پر ان کا ہاتھی تھک کے عاجز آگیا تھا اسلئے اس کا نام محسر ہوا عربی میں "حسرت الدابہ" جانور تھک گیا "حسر الدابہ" جانور کو تھکا دیا، استعمال ہے۔ اور یہ ثابت ہو کہ محسر مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ صحاح میں روایت ہے کہ آنحضرت صلعم مزدلفہ سے نہایت وقار و سکون کے ساتھ چلے۔ اور سب لوگوں کو حکم دیا کہ نہایت سکون کے ساتھ چلیں لیکن جب وادی

محسّر میں پہنچے، آپ نے رفتار تیز کر دی (دیکھو ترمذی وصحیح مسلم) علماء نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ محسّر اصحاب فیل کے عذاب کی جگہ تھی اسلئے آنحضرت صلعم نے وہاں سے جلد نکل جانا چاہا۔ اس کی تائید امام شافعیؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جو کتاب الام وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ بطن محسر میں سواری کو تیز کر دیتے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے۔

الیك تعدو قلقا وضینها　　مخالفا دین النصاری دینها

وہ تیری طرف دوڑ رہی ہے اس حالت میں کہ اس کا تنگ ڈھیلا ہو چکا ہے،

اس کا دین نصاریٰ کے دین کے خلاف ہے۔

حضرت عمرؓ کا منشاء یہ ہے کہ اے پروردگار جس طرح ایک بندہ اپنے آقا کی طرف مستعدی وسرگرمی سے بڑھتا ہے اسی طرح میں بھی مستعدی اور سرگرمی سے تیرے حضور میں حاضر ہو رہا ہوں۔ تقاضائے ادب یہ تھا کہ نہایت وقار وسکون کے ساتھ قدم اٹھاتا، جیسا کہ تو نے تعلیم فرمایا ہے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ اللہ کے ذکر کی طرف مستعدی سے بڑھو، لیکن میں نے ناقہ کو تیز چلا دیا ہے کہ اس وادی سے جلد نکل جاؤں، جس میں تو نے ان نصاریٰ کو برباد کیا جو تیرا گھر ڈھانے کے قصد سے آئے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ناقہ کو تیز چلانے کی دو وجہیں بیان کیں۔

۱۔ یہ عذاب کی جگہ ہے اور ایسی جگہ سے جلد نکل جانا قرین تقویٰ ہے۔

۲۔ اصحاب فیل کو یہاں مجبوراً رکنا پڑا تھا، اسلئے یہاں سے جلد نکل جانے میں گویا ان کی مخالفت ہے۔

ان تمام باتوں کی نسبت ناقہ کی طرف مجازاً ہے۔

وادی محسر میں جلدی کرنا سلف کا مذہب ہے۔ چنانچہ وہاں وقوف جائز نہیں ہے۔ موطا میں ہے "مزدلفہ، وادی محسر کے سوا تمام موقف ہے" امام شافعیؒ فرماتے ہیں "حجاج کو صرف منیٰ میں شب بسر کرنی چاہیے۔ اور منیٰ عقبہ کے پاس ہے اور عقبہ بطن محسر تک منیٰ میں نہیں ہے اور نہ بطن محسر منیٰ میں ہے" صحیح مسلم میں ہے کہ محسر منیٰ میں ہے۔ بہرصورت اتنا ثابت ہے کہ بطن محسر منیٰ سے متصل ہے۔ چونکہ ابرہہ کی فوج محسر میں تھی اور وہ مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی اسلئے لازماً اس کا مقدمۃ الجیش محصب میں رہا ہوگا، جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس قدر تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات بہت اقرب معلوم ہوتی ہے کہ یہ سنت رمی عربوں کی اس سنگباری کی یادگار ہو جو انھوں نے ابرہہ کے مقدمۃ الجیش یا اسکے ہاتھیوں پر کی تھی۔ اور جس کے پردہ میں خدا نے آسمان سے بھی سنگباری کی۔

۳۔ یہ بالاتفاق طے شدہ ہے کہ قربانی کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی

یادگار رہی۔ اسلئے اگر رمی کی اصل وہ ہوتی جو لوگوں نے سمجھی ہے یعنی شیطان کو سنگسار کرنا، تو قربانی رمی سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے یا چوتھے دن ہونی چاہئے تھی، حالانکہ قربانی رمی کے پہلے ہی دن ہوتی ہے، پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیطان، دوسرے اور تیسرے دن کیوں سنگسار کیا جاتا ہے جبکہ حضرت ابراہیمؑ اس سے پہلے ہی شیطان کو سنگسار کرکے بیٹے کی قربانی سے فارغ اور دشمن کے فریبوں سے مامون ہو چکے تھے؟ برعکس اس کے اگر اس کو واقعہ فیل کی یادگار مانا جائے تو تمام گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں۔

ابرہہ کی فوج پر پہلے روز جو سنگباری ہوئی، اس سے ایک حد تک نقصان اٹھا کر وہ آگے بڑھنے سے رک گئی اور حجاج نے منیٰ میں واپس آکر شکر گذاری، قربانی، اور تکبیر و تہلیل کے فرائض ادا کئے۔ لیکن ابھی دم خم باقی تھا، دوسرے دن پھر مکہ پر حملہ کرنا چاہا۔ حجاج نے آگے بڑھ کر پھر پتھراؤ کرکے روک دیا، یہی واقعہ تیسرے روز بھی پیش آیا، یہاں تک کہ حجاج کی سنگباری اور دست غیب کی کارفرمائیوں نے پوری فوج کو بری طرح پامال کر دیا۔

۴۔ چوتھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ رمی کے تین دنوں میں سے پہلے دن صرف اس ستون پر کنکریاں مارتے ہیں، جو عقبہ کے پاس اور تینوں ستونوں میں مکہ

سے قریب تر ہے۔ اس روز بقیہ دونوں ستونوں کو ہاتھ نہیں لگاتے غور کرو تو واقعہ کی طبعی ترتیب کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اصحاب فیل پہلے جوش میں مکہ کی طرف بڑھے ہوں گے اور مذکورہ حد تک پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن جب عربوں نے پتھراؤ کر کے چہرے بگاڑ دیئے ہوں گے، ان کا نشۂ جنگ کمزور اور عربوں کا جوش مدافعت مضاعف ہو گیا ہوگا۔ اور دوسرے دن انھوں نے اور آگے بڑھ کر مورچہ قائم کر لیا ہوگا۔

۵۔ جس ستون پر پہلے روز رمی کی جاتی ہے وہ تینوں میں سے سب سے بڑا ہے اور فوج کے حالات کے لحاظ سے یہی ہونا بھی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے حملہ آوروں کی تعداد بہت کچھ گھٹا دی ہوگی۔ اسلئے ضروری ہوا کہ دوسرے ستون کا حجم پہلے کی مقابل کم ہو کہ واقعہ کی پوری تصویر یادگار کے آئینہ میں محفوظ رہے۔ ان باتوں کو شیطان کے حالات سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ جو شیطان حضرت ابراہیم کو بہکانے آیا تھا اس کی یادگار میں یہ ترتیبی تفاوت بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے

۶۔ پہلے اور دوسرے دن رمی کے بعد کعبہ کی طرف رخ کر کے دیر تک

دعا کی جاتی ہے۔ لیکن تیسرے دن کی رمی وتوقف ودعا سے خالی ہوتی ہے۔ اگر یہ رمی شیطان پر ہوتی تو نہ تو دونوں میں اس درجہ اہتمام دعا کی کوئی وجہ تھی نہ تیسرے دن بکقلم ترک کی۔ حضرت ابراہیمؑ کا ارادۂ قربانی بالکل اٹل تھا۔ وہ اپنے دل میں کوئی شائبہ تذبذب نہیں پا رہے تھے۔ اگر شیطان کو سنگسار کرنے کا واقعہ سچ بھی ہوتا تو یہ بات محض لعنت اور تحقیر کے لئے ہوتی۔ ورنہ ان کا عزم بالکل غیر متزلزل تھا۔ البتہ اگر یہ رمی ابرہہ کی دل بادل فوج پر مانی جائے تو اس طویل تضرع وزاری اور اہتمام دعا کی حکمت واضح ہو جاتی ہے کہ ابرہہ کی فوج جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، قریبًا ساٹھ ہزار تھی۔ ایک ایسے لشکر گراں کے مقابل میں فتح ونصرت کی دعا مانگنا اور نہایت الحاح وزاری کے ساتھ خدا کے سامنے دیر تک گڑگڑانا بالکل قرین عقل ہے اور یہ بات دسویں فصل میں گذر چکی ہے کہ عبدالمطلب نے ابرہہ کے مقابل میں فتح ونصرت کی دعا مانگی تھی۔ واقعات کا سلسلہ اس حد تک سمجھ جانے کے بعد یہ بات خودبخود سامنے آجاتی ہے کہ تیسرے دن جب ابرہہ کی تمام جمعیت پارہ پارہ ہو کر تتر بتر ہو گئی، حجاج ان پر بد دعا کرنے سے رک گئے۔

۷۔ لفظ جمرہ کی معنوی خصوصیات اور دلالتیں بھی ہمارے خیال کی تائید

کرتی ہیں۔ عربی زبان تعبیر حقیقت میں تمام زبانوں سے ممتاز ہے، کتابوں میں جمرات کی وجہ تسمیہ سے متعلق مختلف توجیہات مذکور ہیں۔ موطا کی شرح زرقانی میں ہے۔

"جمرات جمرہ کی جمع ہے۔ جمرہ اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں کنکریوں کا انبار ہو۔ چونکہ یہ لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی اس لئے اس کو جمرہ کہنے لگے۔ عربی میں کہتے ہیں " تجمر بنو فلان " فلاں قبیلہ کے لوگ جمع ہوگئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اہل عرب چھوٹی کنکریوں کو جمار کہتے ہیں۔ اسلئے بطریق تسمیہ بالازم ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام یا حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب شیطان آیا تو انھوں نے اس کے کنکریاں ماریں اور وہ بھاگا۔ بھاگنے کے لئے عربی میں جمر کا لفظ ہے۔ اس لئے ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ شہاب قرافی کہتے ہیں۔ جمار جگہ کو نہیں بلکہ کنکریوں کو کہتے ہیں۔ جمرہ کے معنی کنکری کے ہیں، چونکہ ان جگہوں پر کنکریاں زیادہ تھیں اسلئے بلحاظ مظروف جمرات کہنے لگے۔"

زرقانی نے جو توجیہ پہلے بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مقدم رکھا ہے۔ لسان العرب میں یہ توجیہات بیان کی گئیں ہیں:۔

"جمرہ اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے قبائل میں منضم نہ ہو بعضوں نے کہا ہے جمرہ اس قبیلہ کو کہتے ہیں۔ جو دوسرے قبائل کی جمعیت سے نبرد آزما رہے۔ جس میں تین سو کے لگ بھگ شہسوار ہوں۔ جمرہ کا اطلاق ہزار سواروں پر ہوتا ہے۔"

پھر لسان العرب ہی میں ہے :۔

جمرہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایک قبیلہ اپنے تمام حریف قبائل کے مقابل میں اقدام کے لئے مجتمع ہو۔ یہیں سے منیٰ کے ان مقامات کو جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں، جمرات کہنے لگے۔ گویا کنکریوں کا ہر انبار ایک جمرہ ہے۔ یہ جمرات تین ہیں۔ عمر بن بحر کا قول ہے کہ قبیلہ عبس، ضبہ اور نمیر کو جمرات کہتے ہیں۔ دلیل میں ابو حیہ نمیری کے یہ شعر پیش کئے ہیں۔

لنا جمرات لیس فی الارض مثلها   کرام وقد جربن کل التجارب

ہمارے پاس جمرات ہیں جنکا ثانی دنیا میں نہیں۔ شریف اور ہر قسم کے حالات آزمائے ہوئے۔

نمیر و عبس یتقی نفیا نها   وضبة قوم باسهم غیر کاذب

نمیر اور عبس جن کے حملے خوفناک ہیں۔ اور ضبہ جن کا جوش بالکل سچا ہے۔

آگے بڑھ کر، مزید تشریح، ان لفظوں میں کی ہے۔

"حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے "لالحقن کل قوم بجمرتهم"
اس میں انھوں نے جمرہ کا لفظ جماعت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔
اجمروا علی الامیر وتجمروا ، تجمعوا علیہ وانضموا سب ایک
ہی مفہوم کی تعبیر کیلیے استعمال ہوئے ہیں"

ان اقوال میں اگرچہ تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن اتنا واضح ہے کہ جمرہ ایسی جمعیت کو کہتے ہیں جس کو اپنی قوت و شوکت پر اس درجہ اعتماد ہو کہ کسی دوسری جماعت سے وابستہ ہونیکی ضرورت نہ محسوس کرے۔ لفظ کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد، تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس کا بہترین مصداق صرف ابرہہ کی فوج ہو سکتی ہے، جو تمام قبائل سے بے نیاز ہو کر، صرف اپنی طاقت کے بھروسہ پر عرب پر ٹوٹ پڑی تھی۔ چونکہ منی کے ستون اسی کے یادگار تھے اسلئے ان کو جمرات کہا گیا۔

ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ ابو رغال، جس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا، اسی موقع پر سنگسار کیا گیا تھا اور اس کے بعد اہل عرب اس کی قبر کو سنگسار کرتے رہے۔ معجم البلدان میں مغمس کے ذکر میں ہے!

"یہ مکہ کے قریب، طائف کے راستہ میں ایک جگہ ہے۔ ابو رغال یہیں مرا۔
چونکہ اس نے ابرہہ کو رستہ بتایا تھا اسلئے اس کی قبر سنگسار کی جاتی ہے"

اس کی قبر سنگسار کئے جانے کے اسباب اور بھی بیان کئے گئے ہیں، بہرصورت اگر یہ بیان صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ اصحاب فیل کے رجم کی ایک نظیر ہوگی اور نظائر پر قیاس کرنا زیادہ قرین عقل ہے۔ اسلام میں ابورغال کی قبر کو سنگسار کرنا بند کردیا گیا۔ کسی مخصوص قبر کو سنگسار کرنا اسلام کی رفعت اور بلند نظری کے منافی ہے، نیز رمی جمرات واقعہ کی یادگار کے لئے کافی تھی، واللہ اعلم۔

اس تاویل کے اثرات ونتائج

۱۵۔ رمی جمرہ کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اگر یہ صحیح ہے تو، خواہ یہ رمی چڑیوں کی جانب سے ہوئی ہو یا عربوں کے ہاتھوں، اگر یہ واقعہ اصحاب فیل کی یادگار ہے، جو مکہ اور اس مرکز ابراہیمی کے دشمن تھے جو توحید اور دین حنیفی کا سرچشمہ ہے، تو لازماً اس سنت کی ادائیگی اور دعاء کے وقت ہمارے تاثرات وانفعالات اس سے بالکل مختلف ہوں گے جو شیطان یا مینڈھے کی رمی کے تصور کی حالت میں ہوتے، ان دونوں صورتوں کے فرق کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہئیے۔

الف۔ رمی کے وقت جس شخص کا تصور یہ ہوگا کہ وہ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہے، وہ یقیناً اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ یا کوئی قوی داعیہ نہیں محسوس کریگا۔

وہ جانتا ہی کہ یہ کنکریاں وہ ایک پتھر پر پھینک رہا ہے۔ اس سے نہ تو وہ شیطان کے فریبوں سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو مامون خیال کرے گا نہ یہ ہی سمجھے گا کہ کم از کم کچھ دنوں کے لئے اس کے فتنوں کو اس نے مجروح کر دیا۔ اس تصور کے اثرات کا دائرہ اس کی نظر میں معوذتین یا لاحول اور اذان کے دائرہ سے زیادہ وسیع نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے قدرتی طور پر دوسرے مناسکِ حج کی ادائیگی کے وقت جس جذبہ و جوش سے وہ اپنے کو معمور پائے گا۔ اس جذبہ و جوش سے اس رسم کی ادائیگی کے وقت اس کا سینہ بالکل خالی ہوگا، خصوصاً مینڈھے کے بھاگنے کا قصہ اور اس رمی کو اس کی یادگار سمجھنا تو جھوٹ ہونے کے علاوہ انتہائی لغویت بھی ہے فصل کے شروع میں ہم اسکی حقیقت بے نقاب کر چکے ہیں۔

ہاں اگر اس رمی کو واقعہ اصحاب فیل کی یادگار سمجھا جائے تو ہمارے تصورات کا رخ بالکل دوسرا ہوگا۔ اور اس وقت قدرتاً ہمارے تاثرات و انفعالات کی کمیت و کیفیت بھی بالکل مختلف ہوگی، ہم ایک ستون پر چند کنکریاں مار کر اس عظیم الشان نصرت الٰہیہ کے جوش ذکر سے معمور ہو جائیں گے، جو اللہ کے مقدس گھر کے پاسبانوں کے لئے مخصوص ہوئی۔ ہم یاد کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے دست تصرف نے ہمارے دشمنوں کے تمام داؤ بیکار کر دئیے۔ ان کی عظیم الشان جمعیت پاؤ

پارہ کردی۔ یہ تصور دنیا کے ایک عظیم ترین واقعہ کا تصور ہوگا۔ یہ ہماری قوت ارادی کی شیرازہ بندی کرے گا۔ ہم سوچیں گے کہ سروسامان کی قلت ڈرنے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل سلاح کار خدا کا بھروسہ ہے۔ اس کی غیبی فوجیں، ہماری بے سروسامانی کے باوجود ہمارے دشمنوں پر ہم کو فتح دلا سکتی ہیں، ہر حال میں اس کے فضل و نصرت کی رجاء ہونی چاہئے، پھر اتنی ہی نہیں بلکہ ہم اپنے تئیں مجاہد سمجھیں گے، جو ظاہری اسلحہ کے ذریعہ نہیں بلکہ قوت ارادی کے ہتھیاروں اور اللہ اکبر کی تکبیروں سے دشمن کی فوجوں کو سنگسار کر رہے ہیں[۱]۔

پھر جب رمی کے بعد دعا کیلئے کھڑے ہوں گے تو اس حالت سے بالکل نکل نہیں جائیں گے، بلکہ یہ دعا بھی مجاہدین کی دعا ہوگی۔ اس وقت سب کی قوت ارادی کا مرکز ایک ہوگا۔ ایک بڑی جماعت جب اپنے دلوں کے ایک ہی مرکز عبدیت و نیاز کی طرف جھک جاتی ہے۔ اور کسی ایک ہی آرزو کیلئے سب کی دعائیں اور التجائیں متحد ہو جاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ نماز جماعت اور نماز استسقاء میں یہی حقیقت مضمر ہے۔ علاوہ بریں، یہ دعا ان لوگوں کو اس جماعت سے بالکل علیحدہ اور ممتاز کر دیتی ہے جنکا محور نظر

---

[۱] رمی کے وقت ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کی شرط اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ مترجم۔

صرف قوت ارادی کی جمع و تشکیل ہی۔ مثلاً جادوگر اور بت پرست، گویا جس مقصد کیلئے ہم رمی جمار کرتے ہیں یہ دعا اس کی تصحیح و تکمیل کرتی ہے۔

حج سرتاسر مشق جہاد ہے

۱۷۔ چوپایہ کا ذبح کرنا ذبح نفس کی علامت ہے۔ یہ قربانی ایک فدیہ ہے گویا ایک چوپایہ کے عوض ہم اپنی جان چھڑا لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حقیقت جہاد کی ہے۔ یعنی نفس کو ذبح کر کے اس کو جہنم کی آگ سے بچا لینا، پھر دیکھو حج کے تمام آداب و مناسک میں بعینہٖ جہاد کی حقیقت جلوہ گر ہے۔ یہ روز کا کوچ و قیام اور عجلت کی نمازیں کیا ہیں؟ یہ بالکل فوجی مشق و تمرین ہے، ہر حج کرنے والا پورے یقین کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہ مرحلے کسی قائد ہی کی قیادت کے مقتضی ہیں۔ منازل پر حجاج کی حالت علانیہ فوجی نظم کی ضرورت کا یقین دلاتی ہے۔ یہ حالات بنی اسرائیل کے خروج مصر کے حالات سے مشابہ ہیں۔ ان کا کوچ و قیام بالکل فوجی نظم کے ماتحت ہوتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سپہ سالار تھے، جو ایک طرف جنرل کی طرح فوج کی قیادت کرتے تھے۔ اور دوسری طرف قاضی کی طرح بیٹھ کر فصل مقدمات کرتے تھے:

مسلمان حج میں اپنے ارادہ جہاد کی تصحیح کرتا ہے اور ان تمرینی مشقتوں کو برداشت کرکے گویا اس امر کا اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے بالکل سربکف آمادہ ہے اگر رمی کو رمی شیطان کی یادگار مانو تو حج کا یہ تمام فلسفہ بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض طبیعتوں میں یہاں خدشہ پیدا ہو کہ یہ رائے بالکل نئی ہے۔ حج کے متعلق یہ بات نہ تو دوسروں سے سنی اور نہ خود اپنے ذہن میں آئی کہ اس کو جہاد سے کوئی تعلق ہے۔ یہ تو محض ایک سادہ عبادت ہی، جنگ و جہاد سے اس کو کیا واسطہ! اسی لئے فرمایا گیا ہے لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔ اس خدشہ کے جواب کے لئے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جس کا یہ محل نہیں۔ اپنے مقام پر یہ بحث آئے گی۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں حوالہ قلم ہوئیں۔ والحمد للہ رب العلمین والسلام علی نبیہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین ۰۔

سلسلۂ دائرہ حمیدیہ نمبر ۵

تفسیر

سورۂ کافرون

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبدالاحد اصلاحی

اصلاح پریس سرائے میر میں چھپی

سنہ ۱۳۵۶ھ

۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱) کہہ اے کافرو!

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) نہ میں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۳) اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) اور نہ میں پوجوں گا جسے تم لوگ پوجتے آئے۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۵) اور نہ تم لوگ پوجو گے جسے میں پوجتا ہوں۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶) تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین۔

سورہ کا تعلق ماقبل سے

(۱) سورہ کوثر میں مسلمانوں کو فتح و غلبہ کی بشارت اور اس امر کی خوشخبری دی گئی ہے کہ ان کے دشمن اسلام کے شجرہ مبارکہ سے یکقلم کاٹ دئے گئے۔ اس کے بعد یہ سورہ رکھی گئی جس میں کفار سے قطع تعلق کا اعلان ہے۔ جیسا کہ سورہ کی تفسیر سے واضح ہوگا۔

یہ جنگ اور برأت کی سورہ ہے

(۲) یہ سورہ کفار سے علیحدگی اور قطع تعلق کی سورہ ہے۔ اس لئے اس کو سورہ برات کی طرح ہجرت اور جنگ کی سورہ سمجھنا چاہئے۔ سورہ برات فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اور یہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ سورہ برأت کی ابتدا اعلان برأت ہے اور یہ یکسر اعلان برأت ہے۔ سلف نے بھی اس سورہ کی حقیقت یہی سمجھی ہے۔ چنانچہ اس کے ناموں سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔

اس سورہ کا نام منابذہ، اخلاص اور مقشقشہ ہے۔ لسان العرب میں ہے "احادیث میں وارد ہے کہ سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کا نام مقشقشان تھا۔"

مختصراً ان ناموں کی تشریح سن لینی چاہئے اس سے سورہ کی صحیح تاویل کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

منابذہ کا مطلب ہے کسی سے تمام علائق کو قطع کردینا۔ قرآن میں ہے: فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔

اخلاص کے معنی ہیں مومنین کو مشرکین سے علیحدہ کرنا۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ
اور تاکہ اللہ مومنین کو چھانٹ لے اور کافروں کو مٹا دے۔

انبیاء کی بعثت کا یہی اصلی مقصود ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اخلاص کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اخلاصِ باطن، اخلاصِ ظاہر کا سبب ہے۔ اخلاصِ باطن کی جڑ توحید ہے، اس لئے توحید مشرکین سے علٰحدگی کی گویا اصلی علت ہو گی۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مقشقشہ، وہ سورہ جو قرب صحت اور نجاست شرک سے علٰحدگی کی خبر دے رہی ہے۔ تقشقشہ کے معنی ہیں ظہور صحت کے۔ چیچک اور زخم وغیرہ کے بعد جب جلد سوکھ جاتی ہے تو اس کی تعبیر کے لئے یہی لفظ ہے۔ غور کرو کہ یہ لفظ حقیقت کی تعبیر کیلئے کس قدر موزوں ہے۔ ہجرت، برأت اور جنگ بظاہر نہایت گھناؤنی اور مکروہ چیزیں ہیں لیکن انہی پردوں کے اندر سعادت و کامرانی کا مقدس چہرہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نام سورہ کے اصلی مفہوم سے کس قدر لگتے ہوئے ہیں؟۔

قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو ابتدائے نبوت ہی میں برأت کا حکم دیدیا تھا۔ سورۂ

شعرا میں ہے۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ — اور اپنے قرابتداروں کو ڈراؤ اور جن

الْأَقْرَبِينَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ — مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے ان

لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ — پر شفقت کرو۔ پس اگر وہ (کفار)

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي — تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے کہہ دو

بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ وَتَوَكَّلْ — کہ میں تمہارے اعمال سے بری ہوں اور

عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ — خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو۔

سورہ یونس میں فرمایا۔

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي — اگر وہ تمہیں جھٹلا دیں تو ان سے کہہ دو

عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنتُم — کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا

بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا — تمہارا عمل۔ تم میرے عمل سے بری

بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ — ہو۔ اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں۔

یہ آیت بالکل "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" کے ہم معنی ہے۔

سورہ انبیاء میں فرمایا۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ — اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو میں نے

عَلٰی سَوَآءٍ وَاِنْ اَدْرِیْ — تمہیں عام طور پر خبردار کر دیا اور
اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا — میں نہیں جانتا کہ جس چیز کی تمہیں
تُوْعَدُوْنَ۝ — دھمکی دیجا رہی ہے وہ قریب ہے یا دور ہے

پس جب مکہ اور اس کے اطراف کے کفار نے آنحضرت صلعم کی دعوت سے انکار کر دیا اور نفرت و عداوت کے جوش میں آپ کے قتل اور اخراج پر کمربستہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو برأت، ہجرت اور جنگ کا حکم دیدیا۔

انبیائے کرام کی دعوت و تبلیغ کے معاملہ میں قانون الٰہی ہمیشہ سے یونہی رہا ہے ایک مدت تک ان کو صبر و تحمل اور انتظار فتح و نصرت کا حکم دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے سرکش طبیعتیں تسلیم و قبول کی طرف مائل ہوں لیکن جب ان کی طرف سے برابر سرکشی کا اظہار ہوتا ہے اور سرکشی آہستہ آہستہ پیغمبر کے ارادۂ قتل و اخراج تک متعدی ہونے لگتی ہے تو خدا کا آخری حکم برأت، ہجرت اور جنگ کے اعلان اور انتقام کی تازیانہ کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوں۔ ظالم ہلاک ہوں اور ان کی جگہ اہل ایمان خدا کی زمین میں متمکن ہوں۔ یہی بعثت کی اصلی غرض ہے۔ اپنی کتاب ملکوت اللہ میں اس بحث کو ہم پوری تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ بعض شواہد اس کتاب میں بھی ملیں گے۔

بعثت کے مراحل: برأت، ہجرت اور غلبہ

۲۔ کسی قوم میں کسی رسول کی بعثت کا زمانہ اس قوم کے بحران کا زمانہ ہوتا ہے اور اس وقت تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ظہور میں آجاتی ہے۔

(۱) پوری قوم اپنی شرارتوں کی پاداش میں ہلاک کردیجاتی ہے۔ صرف ایک مختصر جماعت نیکو کاروں کی بچ رہتی ہے اور یہی جماعت ہلاک ہونے والوں کی جگہ زمین کی وارث ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور اکثر انبیاء کی امتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

۲۔ تباہی اور ہلاکت کی آخری منزلوں تک پہنچکر یک بیک قوم پیغمبر کی دعوت سے چوکنی ہوجاتی ہے اور خدا کی رحمت اس کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے حضرت ابراہیم، حضرت داؤد، حضرت یوسف اور پیغمبر عالم علیہم الصلوۃ والتسلیم کی امتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

۳۔ ایک امت تباہ کردیجاتی ہے اور دوسری زندہ کی جاتی ہے حضرت موسیٰؑ اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں یہی معاملہ پیش آیا حضرت

یعقوبؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے انتقام میں فرعون اور کسریٰ کی قومیں مٹادی گئیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات میں ان حقائق کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے۔

اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ	یا تو جس چیز کی ہم ان کو دہمکی
نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ	دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ
فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ	ہم تم کو دکھادیں گے یا یہ ہوگا
اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا	کہ ہم تمکو وفات دینگے اور ان کا
يَفْعَلُوْنَ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ	پلٹنا ہماری طرف ہوگا۔ پھر اللہ
رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ	انکے اعمال پر گواہ ہوگا۔ ہر امت
رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ	کیلئے ایک رسول ہے۔ جب ان کا
بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ	رسول آجاتا ہے۔ عدل کیساتھ انکو
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا	درمیان فیصلہ کردیاجاتا ہے اور انکو
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ	ساتھ کوئی کمی نہیں کیجاتی۔ وہ کہتے
صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّآ	ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ تمھاری
اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا	یہ دہمکی کب پوری ہوگی۔ کہدو میں

وَلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ	تو اپنی جان کیلئے بھی کسی نفع ونقصان
لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا	کا مالک نہیں۔ مگر جو اللہ چاہے ہر امت
جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا	کیلئے ایک اجل معین ہے جب انکی اجل
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً	آجائیگی۔ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹینگے۔ نہ
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ؕ	ایک گھڑی آگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیا، کی بعثت کا اصلی مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جو امت صالح اور نیکوکار ہے وہ زندگی اور حیات کے ولولوں سے معمور ہو جائے اور جو قوم راہ حق و ہدایت سے ہٹکر گمراہیوں اور شرارتوں میں پڑ چکی ہے وہ تباہ ہو جائے۔ اور یہ بات بالکل آپ سے آپ ظہور میں آتی ہے۔ سرکش اور نافرمان قوموں کا ہمیشہ یہ چلن رہا ہے۔ کہ جب ان کے پاس انبیاء آئے انھوں نے ان کی تکذیب کی۔ قرآنِ مجید نے ان کی اس حالت کی طرف جابجا اشارات کئے ہیں۔ مثلاً

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا	افسوس ہے بندوں پر، نہیں آتا
يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا	ان کے پاس کوئی رسول۔ مگر
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ؕ	انھوں نے اسکے ساتھ استہزا کیا

دوسری جگہ ہے۔

كُلَّمَا جَآءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا	جب کسی امت کے پاس اسکا رسول
كَذَّبُوهُ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ	آیا اس نے اسکی تکذیب کی بس ہم نے
بَعْضًا وَّجَعَلْنَاهُمْ	ایک پیچھے دوسری کو لگا دیا اور سب کو
أَحَادِيثَ	مٹا کر افسانہ کر دیا۔

پھر صرف تکذیب اور استہزا ہی پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ جبارت کا ایک قدم اور آگے بڑھا کر پیغمبر کے اخراج یا قتل کا ارادہ کر لیتی ہیں۔ اور یہ اس معاملہ کی آخری حد ہے۔ قرآن مجید نے جابجا انبیا کی سرگذشتوں کے ذیل میں اس صورت حال کی طرف اشارات کئے ہیں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ	ان سے پہلے نوح کی قوم نے تکذیب کی
وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ	اور اسکے بعد جماعتوں نے اور ہر امت
وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ	نے اپنے رسول کی طرف ہاتھ بڑھایا
لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا	کہ اسکو پکڑ لے اور باطل کو لیکر مجادلہ
بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا	کیا کہ اسکے ذریعہ حق کو شکست دیدے
بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ	پس میں نے ان کو پکڑ لیا پھر دیکھو

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○ | میرا عذاب کیسا دردناک ہوا اور یہی
وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ | ہی تیرے رب کا کلمہ کافروں پر صادق
رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا | ہو چکا ہے کہ وہ جہنم میں پڑینگے۔
اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ○

یعنی قانون الٰہی کے بموجب تباہ ہوں گے۔ جب وہ نبی پر حملہ کرنا چاہیں گے، نصرت الٰہیہ اپنے تمام نتائج و آثار کے ساتھ نمودار ہو جائے گی۔

لیکن نصرتِ الٰہیہ کے ظہور کا بھی ایک قانون ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب پیغمبر برأت کا اعلان کر کے کفار کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتا ہے۔ نصرتِ الٰہیہ کے ظہور سے پہلے پیغمبر کے لئے ان مراحل سے گذرنا ناگزیر ہے۔ قرآن مجید نے اجابجا اس قانون الٰہی کی طرف اشارات کئے ہیں۔ مثلاً

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ | بے شک جو لوگ اللہ کی اور اسکے رسول
وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي | کی مخالفت کرتے ہیں وہی لوگ ذلیل
الْاَذَلِّيْنَ ○ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ | ہونیوالوں میں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ
اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ | نے لکھ دیا ہے کہ البتہ میں غالب ہونگا
عَزِيْزٌ ○ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ | اور میرے انبیاء۔ بیشک اللہ قوی

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ
مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ
اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ
اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ
كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ
وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ
وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ
رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ
حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

اور غالب ہے۔ تم کوئی ایسی قوم نہیں
پا سکتے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان
رکھتی ہو پھر ان لوگوں سے یارانہ
رکھتی ہو جو اللہ اور اس کے رسول
کے مخالف ہیں۔ اگرچہ ان کے باپ
ہوں، یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں
یا کنبہ و خاندان کے ہوں، یہی لوگ
ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں
میں ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی
جانب سے روح سے ان کی تائید فرمائی
ہے اور ان کو ایسے باغوں میں داخل
کریگا جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی۔ اسمیں
ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا وہ
اللہ سے راضی ہوئے۔ وہی لوگ اللہ
کی جماعت میں۔ یقیناً اللہ ہی کی جماعت کامیاب

....

انبیاء کے غلبہ کیلئے جو قانون الہٰی ہے، آیت میں پہلے اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر اس سنت برأت کا ذکر فرمایا جو مومنین کیلئے ناگزیر ہے۔ اس کے بعد اپنے قانون کا حوالہ دیا کہ وہ مومنین کو بخشے گا اور ان کو اپنی جماعت میں داخل کرے گا اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ اگلی فصلوں میں، اسکے شواہد تمھارے سامنے آئیں گے۔ "اَنَا وَرُسُلِیْ" میں "و" بیان کے لئے ہے۔ ان آیات میں بیان کیا ہے کہ غلبہ اللہ کی جماعت کیلئے ہے اور اس جماعت ہی کا غلبہ اللہ اور اسکے رسول کا غلبہ ہے۔ کیونکہ بعض انبیاء کو ان کی زندگی میں غلبہ نہیں حاصل ہوا۔ بلکہ ان کی موت ہجرت کی قائم مقام ہوئی۔ موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے متبعین کو فروغ دیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے معاملہ میں یہی ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو بھی، انکے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومنین کا غلبہ درحقیقت رسول ہی کے غلبہ کا ثمرہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ	ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو
اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا	جو ان پر ایمان لائے دنیا کی زندگی
وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْہَادُ	میں غالب کرینگے اور اسدن جبدن گواہ

یہاں بھی "و" بیان کیلئے ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مومنین کا غلبہ رسول کا غلبہ ہے اور رسول کا غلبہ اللہ کا غلبہ ہے۔ یہی "لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ" کی صحیح تاویل ہے۔ اور بعینہٖ یہی حقیقت اس آیت میں مضمر ہے۔

فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ	یا تو یہ ہوگا کہ جس چیز کا ہم ان سے وعدہ
نَعِدُھُمْ اَوْنَتَوَفَّیَنَّکَ	کر رہے ہیں اس میں کچھ تم کو دکھا دینگے
فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ ہ	یا تم کو وفات دیدینگے۔ پس وہ ہماری
. . . .	طرف لوٹائے جائیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ	یاد کرو، جب اللہ نے کہا اے عیسٰی میں
مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ	تمہاری مدت پوری کرونگا اور اپنی
اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ	طرف اٹھانے والا ہوں اور تم کو کافروں
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ	سے پاک کرنیوالا ہوں اور ان لوگوں کو
الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ	جنھوں نے تمہاری پیروی کی ان لوگوں
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ	کے اوپر غلبہ دینے والا ہوں جنھوں نے
الْقِیٰمَۃِ ط	کفر کیا، قیامت کے دن تک۔

اسی قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ اور جن کو غلبہ و نصرت سے سرفراز فرماتا ہے وہ حزب اللہ کے لقب سے ممتاز ہوتے ہیں۔

نصرت الہیہ کا ظہور ہجرت کے بعد ہوتا ہے

۴۔ کاروبار نبوت کی پہلی منزل نصح و دعوت اور صبر ہے، اسکے بعد براءت و ہجرت کی منزل آتی ہے اور سب سے آخر میں فتح و کامرانی کی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ صرف آنحضرت صلعم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا۔ یہ اس کا ایک عام قانون ہے جو تمام انبیاء بلکہ تمام خلق کیلئے یکساں ظاہر ہوا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اسکی طرف اشارات ہیں، بعض سورتوں میں، یہ چیز عمود کی حیثیت رکھتی ہے اور بعض میں اس کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ سورہ اعراف، ہود، یوسف اور نحل میں اسکی تفصیلات موجود ہیں۔ ہم صرف بعض جامع آیات کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ	قریب تھا کہ تجھکو اس زمین سے گھبرا دیں
مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ	تاکہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور اس وقت
مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ	تیرے بعد وہ بھی اس میں بہت ہی کم

خِلَافَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ہ سُنَّۃَ	رہیں گے۔ یہ ہمارا قانون رہا ہے
مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ	ان تمام انبیاء کے ساتھ جو تم سے
مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ	پہلے ہم نے بھیجے اور تم ہمارے قانون
لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ہ	میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب انبیاء مایوس ہوگئے
وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا	اور کفار نے گمان کر لیا کہ ان کو جو
جَآءَهُمْ نَصْرُنَا	دھمکیاں دی گئی ہیں، جھوٹی ہیں،
....	ہماری مدد (ان) کے پاس آگئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب پیغمبر ہجرت کرتا ہے، احتساب کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ اس وقت اسلام غالب ہوتا ہے اور کفر ہزیمت اٹھاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ	کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی
مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ	جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں قوم نوح، قوم
وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ہ وَالَّذِيْنَ	عاد، قوم ثمود اور وہ قومیں جو ان کے

مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ	بعد گذریں۔ اور جنکا حال اللہ ہی
إِلَّا اللَّهُ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ	کو معلوم ہے۔ انکے پاس انکے رسول
بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ	روشن دلیلیں لیکر آئے لیکن انھوں نے
فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا	اپنے منھ پر ہاتھ رکھے اور کہا جو بات
كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَ	تم لیکر آئے ہو ہمیں اس سے انکار ہے۔
إِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا	اور جس بات کی طرف تم بلاتے ہو
تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ	ہمیں اس میں شک ہے ان کے رسولوں نے
قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ	کہا، کیا تمھیں اللہ کے بارے میں شک
شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَ	ہے؟ وہ اللہ کہ آسمان و زمین کا
الْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ	بنانیوالا ہے۔ وہ تمھیں بلا رہا ہے
لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَ	کہ تمھارے گناہ بخشدے اور ایک
كُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى قَالُوا	مقررہ مدت تک مہلت دے۔
إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا	انھوں نے کہا، تم تو بس ہماری
تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا	ہی طرح کے آدمی ہو۔ چاہتے ہو
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا	کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دا

فَأْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝	پوجتے آئے ان کی پوجا کرنے سے
قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ	ہمیں روک دو اگر ایسا ہی ہے تو
نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	کوئی واضح دلیل پیش کرو۔ ان کے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ	رسولوں نے جواب دیا۔ ہم تمہاری
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا	ہی طرح آدمی ہیں لیکن اللہ
كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ	جس بندہ پر چاہتا ہے اپنا فضل و
بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ	احسان کرتا ہے اور یہ بات ہمارے
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی
الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا	معجزہ لا دکھائیں مگر اللہ کے حکم
لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ	سے۔ اور اللہ ہی ہے جس پر ایمان
وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا	رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے
وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا	اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر
اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ	بھروسہ نہ کریں حالانکہ اس نے
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝	ہماری راہوں میں ہماری رہنمائی
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	کی ہے اور ہم ان ایذاؤں پر صبر

لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ
مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ
فِي مِلَّتِنَا ط فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ
رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ
وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ
مِنْ بَعْدِهِمْ ط ذَٰلِكَ
لِمَنْ خَافَ مَقَامِي
وَخَافَ وَعِيدِ
وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ
كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ مِّنْ
وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ
مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ
. . . .
. . . .

کرینگے جو تم ہمیں دیتے ہو اور اللہ
ہی ہے جس پر بھروسہ کرنیوالوں کو
بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اور کافروں نے
اپنے رسولوں سے کہا ہم تمھیں اپنے
ملک سے ضرور نکال باہر کرینگے یا تم کو
ہمارے مذہب میں لوٹنا ہوگا۔ تو ان کے
رب نے ان پر وحی بھیجی کہ البتہ ہم ظالموں
کو ہلاک کر ڈالینگے اور ان کے بعد تمھیں
زمین میں جگہ دینگے۔ یہ ہی نتیجہ اسکے
لئے جو ہمارے حضور کھڑے ہونے سے اور ہماری
وعید سے ڈرا پیغمبروں نے فتح کی دعا
مانگی اور سرکش نامراد ہوئے۔ ان کے آگے
جہنم ہے وہاں خون اور پیپ کا پانی
پلایا جائے گا۔

انبیاء کے ساتھ جو معاملات پیش آتے ہیں، ان آیات میں انکی تفصیل کردیگئی ہے۔

اس خاص معاملہ میں، جو سنت الٰہیہ جاری و نافذ ہے اس کو سمجھنے کیلئے، ان آیات کو پیش نظر رکھو۔ انبیاء کا دستور یہ ہے کہ وہ توحید کی دعوت دیتے ہیں، توبہ کی منادی کرتے ہیں، مغفرت کا اعلان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بندگی اور بیچارگی کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اللہ کے بھروسہ کے سوا، کوئی چیز نہیں ہے جس پر ان کا اعتماد ہو۔ کفار اسکے جواب میں ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے ہیں۔ توحید کا انکار کرتے ہیں، وعدۂ قیامت کا مذاق اڑاتے ہیں اور بالآخر پیغمبر کو ملک سے نکال دینے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے، پیغمبر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے، اس وقت اللہ کی مدد ظہور میں آتی ہے ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور اہل ایمان ان کی جگہ زمین کے وارث ہوتے ہیں۔

پیغمبر، امت کیلئے امان، اور برأت، توبہ کی مہلت سے

۵۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں برأت و ہجرت کی تصریح نہیں ہے لیکن "لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ...... وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ" کے سیاق پر غور کرو۔ یہ مضمون اسکے اندر چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ انبیاء کے قصوں میں، یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ظالموں کی بربادی ہجرت کے بعد واقع ہوتی ہے۔ جب تک

رسول، قوم کے اندر رہتا ہے وہ قوم کے لئے سپر ہے۔ خدا کا قہر و غضب اسوقت تک نمودار نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ مایوس ہوجاتا ہے اور خدا کی طرف سے اسکو ہجرت کی اجازت مل جاتی ہے وہ برأت کا اعلان کرکے ہجرت کا عزم فرماتا ہے۔ یہ توبہ وانابت کی آخری مہلت ہوتی ہے جو قوم کو ملتی ہے۔ حضرت یونسؑ اور انکی قوم کا معاملہ اس کی بہترین مثال ہے۔ پیغمبر کی ہجرت کے بعد اگر قوم توبہ و استغفار کی طرف متوجہ نہیں ہوتی، فتح و عذاب کی گھڑی نمودار ہوجاتی ہے۔ سورۂ انفال میں اس حقیقت کی تصریح ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ	اور اللہ کو زیبا نہ تھا کہ تو ان کے اندر
وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ	موجود ہو اور ان کو سزا دے اور
اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ	اللہ ان کو کبھی سزا نہ دیتا اور آنحالیکہ
يَسْتَغْفِرُونَ ۝ وَمَا لَهُمْ	وہ معافی مانگ رہے ہوں۔ لیکن اب
أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ	کیا ہے کہ انھیں سزا نہ دے حالانکہ
يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ	وہ مسجد حرام سے روک رہے ہیں،
الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ	باوجودیکہ وہ اسکے متولی نہیں ہیں،
إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ	اسکے متولی صرف وہی لوگ ہوسکتے

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ہیں جو پرہیزگار ہوں لیکن ان

.... میں کے اکثر نہیں جانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اس بات کے مستحق ہو چکے تھے کہ بیت اللہ کی تولیت سے معزول کردئے جائیں، اور عذاب الٰہی نمودار ہوکر ان کو تباہ کردے لیکن جبتک پیغمبر کا مقدس وجود، صلحاؤ ابرار کی ایک جماعت کے ساتھ، ان کے اندر موجود رہا اس وقت تک وہ عذاب سے محفوظ رہے۔ یہاںتک کہ پیغمبر نے ہجرت کی اور انکو توبہ کی توفیق نہ ہوئی۔ اس وقت خدا کا قانون ظاہر ہوا۔

اس باب میں نہایت بلیغ اور پر اثر کلمات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ انھوں نے جب یروشلم کی عورتوں کو روتے دیکھا، فرمایا "اے یروشلم کی بیٹیو! میرے حال پر مت روؤ، اپنے اور اپنی اولاد کے حال پر ماتم کرو۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیا سے ہجرت یہود کی بدبختی کا پیام تھی اور آپنے اس کی خبر بھی دیدی تھی لیکن یہود متنبہ نہیں ہوئے، بالآخر چالیس برس کی مہلت کے بعد، خدا کے عذاب نے ان کو پکڑ لیا۔

سورہ برأت کی ابتدائی چھ آیتیں پڑھو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ آخری برأت بھی مہلت اور توبہ کی امید سے خالی نہیں ہوتی۔

سورہ کے الفاظ کی شہادت کہ یہ اعلان براءت ہے

۶۔ اگر اس سورہ کے الفاظ پر غور کروگے اور جو آیتیں پچھلی فصلوں میں ہم نقل کرچکے ہیں، ان کو سامنے رکھوگے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہوجائے گی کہ یہ سورہ، براءت اور ہجرت کی سورہ ہے۔ لیکن مزید توضیح کے لئے اس مضمون کی دوسری آیات بھی ہم یہاں نقل کردیتے ہیں تاکہ کسی طرح کا اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہ اقوال ہیں جو انھوں نے اپنی قوم سے علٰحدہ ہوتے وقت فرمائے ہیں۔ اگر وہ اقوال پوری طرح اس سورہ کے الفاظ سے ہم آہنگ ہوجائیں تو بس سمجھ لو کہ دونوں ایک ہی حالت میں کہے گئے ہیں۔

(الف) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت کا یہ حصہ قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ	تمھارے لئے ابراہیم اور اسکے ساتھیوں
حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيمَ وَ	کی زندگی میں بہترین نمونہ تھا جب
الَّذِيْنَ مَعَهٗ إِذْ قَالُوْا	انھوں نے اپنی قوم سے کہا ہم تم سے

لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ
وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ
اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى
تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ
إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ
لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا
أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ
مِنْ شَيْءٍ ط رَبَّنَا عَلَيْكَ
تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا
وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ
. . . .
. . . .
. . . .

اور ان چیزوں سے، جن کی تم
اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو، بالکل
بری ہیں۔ ہم نے تمھارا انکار کیا
اور ہمارے اور تمھارے درمیان
ہمیشہ کیلئے عداوت و نفرت
آشکارا ہو گئی یہاں تک کہ تم
اللہ واحد پر ایمان لاؤ۔ ہاں
مگر (ایک بات اس عام اعلان
سے مستثنیٰ حکم رکھتی ہے) ابراہیم کا
اپنے باپ سے کہنا کہ میں آپکے لئے
خدا سے بخشائش چاہوں گا اور
میں اللہ کی طرف سے آپکے لئے
کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا پروردگار
ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور تیری
طرف جھکے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے

یہ "بَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ" الخ ہجرت اور جنگ کا اعلان ہے

اور "رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا" الخ بوقت ہجرت دعائے فتح و نصرت ہے۔

(ب) اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے اصنام سے بھی اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مشرکین کے تمام اجتماعی و معاشرتی رشتے انہی فرضی دیوتاؤں کی بدولت قائم تھے۔ پس ان سے علیحدہ ہو جانا، صرف ان سے علیحدہ ہونا نہ تھا، تمام مشرکین سے یکقلم کٹ جانا تھا، آگے ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

سورۂ شعراء میں جہاں اس معاملہ کا ذکر آیا ہے، حضرت ابراہیم نے اعلان برأت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ	دیکھو تو سہی ان چیزوں کو جنکو تم پوج
أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ	رہے ہو۔ تم اور تمہارے اگلے باپ دادا۔ یہ سب
فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا	چیزیں تو میری دشمن ہیں۔ مگر اللہ تمام
رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝	عالم کا پروردگار۔

اظہار نفرت و عداوت اور اعلان برأت کے لئے یہ اسلوب کلام سخت ترین تھا۔

(ج) سورۂ زخرف میں فرمایا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ — اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے
وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا — باپ اور اپنی قوم سے کہا میں
تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ — ان چیزوں سے بری ہوں جن کو
فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ — تم پوجتے ہو۔ ہاں وہ ذات میری
وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً — معبود ہے جس نے مجھکو پیدا کیا ہے
فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ — بیشک وہ میری رہبری کریگی
يَرْجِعُوْنَ ۝ — اور اس بات کو اللہ تعالیٰ نے
.... — اسکے بعد ایک باقی رہنے والا کلمہ
.... — بنایا تاکہ وہ رجوع کریں۔

"وہ میری رہبری کریگی" یعنی مقام ہجرت کی طرف۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ "فِیْ عَقِبِہٖ" یعنی بعد اسکے کہ وہ تہدید و نصیحت کے طور پر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تاکہ لوگ شرک سے توبہ کریں۔ عموماً مفسرینؒ "کلمۃً باقیۃً" سے کلمہ توحید سمجھا ہے۔ اور بعضوں نے "مسلم" کا لقب جو انھوں نے اپنے پیرؤوں کو بخشا۔ لیکن یہ دونوں تاویلیں بعید ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے جو بات کہی تھی "کلمۃ باقیۃ" سے وہی بات مراد ہے۔ "فی عقبہ"

سے عموماً لوگوں نے اولاد ابراہیم مراد لی ہے۔ یہ غلطی درحقیقت پہلی غلطی کا نتیجہ ہے۔

(د) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کا اعلان اس وقت فرمایا جب حق کی تبلیغ پوری طرح ادا کر چکے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَاِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ	اور ابراہیم کو جب اس نے اپنی قوم
اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ	کو دعوت دی کہ اللہ کی بندگی کرو
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	اور اس سے ڈرو، یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم
تَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ	سمجھ رکھتے ہو۔ تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا	یہی بتوں کے تھان اور گڑھتے ہو جھوٹی
وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ	باتیں۔ جنکو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یقیناً
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	تمھاری روزی کے مالک نہیں ہیں۔ پس
لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا	اللہ کے پاس اپنی روزی ڈھونڈو اور
فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ	اسکی بندگی کرو۔ اور اس کا حق مانو، اسی
وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ	کی طرف پھر جاؤ گے۔ اور اگر تم جھٹلاؤ گے
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَ	تو کچھ تعجب نہیں تم سے پہلے قوموں نے
اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ	جھٹلایا اور رسول پر نہیں ہے مگر کھول کر

كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ
وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ۝ (ثم ذكر الله سنته
من استبدال قوم بعد
قوم كالجملة المعترضة
حتى عاد فقال) فَمَا
كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّا
اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ
حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ
النَّارِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ
وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا
مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

پہنچا دینا۔ (اس کے بعد کلام بطور
جملہ معترضہ استبدال اقوام و امم
کی سنت الہیہ کے بیان کی طرف
متوجہ ہو گیا ہے، پھر اصلی سلسلہ کلام
عودار ہو جاتا ہے۔) پھر کچھ جواب نہ
تھا اسکی قوم کا مگر یہ کہ بولے اسکو مار ڈالو
یا جلا دو پھر اسکو بچا دیا اللہ نے آگ سے
بلاشبہ اس میں بڑی نشانیاں ہیں
ایمان والوں کیلئے اور ابراہیم نے
کہا تم نے اللہ کے سوا جو بتوں کے تھان
ٹھہرائے ہیں۔ سو آپس کی دوستی کیلئے
دنیا کی زندگی میں۔ پھر قیامت کے
دن ایک دوسرے کا منکر ہو جائیگا
اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا
اور تمہارا ٹھکانا آگ ہو گا۔ اور کوئی

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ	تمہارا مددگار نہ ہوگا۔ پھر لوط نے
يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا	اس کی تصدیق کی اور اس نے کہا
وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا	میں تو وطن چھوڑ کر اپنے رب کی طرف
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۔ فَاٰمَنَ	جاتا ہوں بےشک وہ غالب اور
لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ	حکمت والا ہے، اور دیئے ہم نے
اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ	اس کو اسحٰق اور یعقوب اور رکھا
الْحَكِيْمُ وَوَهَبْنَا لَهٗ	اس کی ذریت میں نبوت اور
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ	کتاب اور بخشا ہم نے اس کا
جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ	اجر دنیا میں اور بےشک
النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ	وہ آخرت میں نیکوکاروں
اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ	میں سے ہوگا۔
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ	....

(۵) بعینہٖ یہی دعوت انھوں نے اس وقت بھی بلند کی تھی، جب بتخانہ میں قوم کے تمام بتوں کو توڑ ڈالا تھا۔ سورہ والصفٰت میں ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ	کہا، کیا اپنی ہی گڑھی ہوئی چیزوں کو

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ	پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے
قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ	تم کو اور ان چیزوں کو جنکو تم بناتے
فِي الْجَحِيْمِ ۝ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا	ہو۔ بولے اسکے واسطے ایک گھر بناؤ
فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ وَ	اور ڈالدو اسکو آگ کے ڈھیر میں۔
قَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ	انھوں نے اسکے ساتھ داؤ کرنا چاہا۔
سَيَهْدِيْنِ ۝ رَبِّ هَبْ لِيْ	لیکن ہم نے انہی کو نیچے ڈالا۔ اس نے
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ	کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ
بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ (ثم ذكر	مجھ کو راہ دیگا (اس نے پروردگار سے دعا
قصة اسمٰعيل ثم قال)	کی) اے رب مجھکو کوئی نیک بیٹا عنایت
وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا	فرما۔ پس ہم نے اسکو ایک حلیم بیٹے کی بشارت
مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝	دی۔ (یہاں چند آیات میں حضرت
....	اسمٰعیل کا واقعہ بیان کرنیکے بعد فرمایا)
....	اور ہمنے اسکو خوشخبری دی اسحاق کی جو
....	نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔

(۹) واقعہ کی تفصیل اور ہجرت کا اعلان سورہ انبیا میں بھی ہے۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ جب قوم کی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت فر

چنانچہ فرمایا۔

أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ	افسوس ہے تم پر اور ان چیزوں
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا	جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو کیا تم
تَعْقِلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	لوگ سمجھتے نہیں؟ بولے اسکو جلا دو
حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا	اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر
اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	تمھیں کچھ کرنا ہے (چند لفظوں میں
فٰعِلِيْنَ ۝ (ثم ذکر	مخالفین کی ایک چال اور ان کی
کیدھم بوخسرانھم	ناکامی کے بیان کے بعد فرمایا) اور
ثم قال) وَنَجَّيْنٰهُ	ہم نے اسکو اور لوط کو اس سرزمین
وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ	کی طرف نجات دی جسکو ہمنے دنیا والوں
بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ	کے لئے بابرکت بنایا اور ہمنے اسکو عنایت
وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ	کئے اسحٰق اور یعقوب بطور عطیہ
وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً	اور ہم نے ہر ایک کو نیکوکاروں
وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝	میں سے بنایا۔

ان آیات پر غور کرو، ان سے ہجرت کے وقت کی تعیین بھی ہو جائے گی۔ کیونکہ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم کو اولاد کی بشارت سنائی گئی ہے اور ہجرت سے پہلے کی حالت معلوم ہے کہ وہ تکلیف اور پریشانی کی حالت تھی۔ ان دونوں حالتوں کے بیچ میں جو نقطہ حد فاصل نظر آئے وہی ہجرت کا زمانہ ہے۔ سورہ مریم میں یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ	باپ نے کہا ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں
اٰلِهَتِیْ یٰاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ	سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں
لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ	سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑونگا
وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ۝ قَالَ	اور بالکل مجھ سے الگ ہو جا۔ ابراہیم
سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ	نے کہا اچھا میرا اسلام قبول ہو۔ اب میں
لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ	پروردگار سے آپکی بخشائش کی دعا
حَفِیًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا	کرونگا، وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	میں نے آپ سب کو چھوڑا اور انھیں
وَاَدْعُوْا رَبِّیْ عَسٰی	بھی جنھیں آپ اللہ کے سوا پکارتے
اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ	ہیں، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں

رَبِّیْ شَقِیًّا ہ فَلَمَّا	امید ہے اپنے پروردگار کو پکار کے
اعْتَزَلَھُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ	محروم نہیں ہوں گا اور جب اس کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَھَبْنَا	عنایت کئے اسحاق و یعقوب
لَهٗ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ	اور ہر ایک کو نبی بنایا۔
وَکُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ہ	....

حضرت ابراہیم کی ہجرت کا یہ معاملہ بالکل متفق علیہ ہے۔ یہود نے واقعہ کی تفصیلات میں بعض تبدیلیاں کر دی ہیں لیکن نفس واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ پیدائش باب ۱۲ میں ہے۔

"اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہو۔"

چونکہ واقعہ مشہور و معلوم تھا اس لئے قرآن مجید نے تذکار موعظہ کا اسلوب اختیار کیا۔ تفصیل کو راہ نہیں دی۔ یہ تمام آیات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ ان کو یکجا کر کے دیکھنے کے بعد حاصل یہ نکلتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مدت تک قوم کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول رہے۔ انذار و تبشیر کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا۔ تلقین و دعوت کی پوری طاقت صرف کر ڈالی لیکن قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بالآخر مایوس ہو گئے۔ اور چاہا کہ ایک مرتبہ کھول کر دکھا دیں کہ جن بتوں کو لوگ پوجتے ہیں بالکل بے جان و بے اختیار ہیں۔ نفع و نقصان کی کوئی بات بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ تنبیہ اور اتمام حجت کی یہ آخری شکل تھی، جو انھوں نے اختیار کی اور نتیجہ وہی نکلا جو ان کا خیال تھا انھوں نے جب تمام بت توڑ پھوڑ کے رکھدیے، قوم کو متنبہ ہوا کہ درحقیقت یہ ہماری انتہائی نادانی تھی کہ ہم ان بے جان پتھروں کی پرستش کر رہے تھے۔ جو خود اپنی حفاظت سے قاصر ہیں۔ اس واقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ملامت کی لیکن اس ملامت سے ان کی حمیت جاہلیت پھر بھڑک اٹھی اور وہ چلا اٹھے کہ اس کو آگ میں جھونک دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ اس کے علاوہ انھوں نے سنگسار کر دینے کی بھی دھمکی دی۔ بس اسکے بعد فریضہ تبلیغ و دعوت کی آخری منزل نمودار ہو گئی۔ یعنی ہجرت کا حکم آگیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام آخری دو ٹوک بات کہکر علاحدہ ہو گئے۔

لفظ "کافرون" سے خطاب دلیل برأت ہے

اس سورہ کے علاوہ، پورے قرآن میں، خدا نے کہیں ان لوگوں کو اس لفظ سے مخاطب نہیں کیا ہے، اس لفظ سے اسی وقت خطاب کیا ہے جب انھوں نے پیغمبر صلعم کو قبول دعوت سے مایوس کر دیا اور اعلان کر دیا کہ وہ اپنے کفر سے ہٹنے والے نہیں۔ ہجرت سے پہلے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ تیسری فصل میں یہ آیت گذر چکی ہے۔ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ۔ یہ ان منکرین کا قول ہے جو جوش مخالفت میں انکار و تمرد کی آخری حالت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسکی مثال سورۂ سبا میں بھی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ	ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں کوئی
مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ	ہوشیار کرنے والا مگر وہاں کے دولتمندوں
مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم	نے کہا کہ جو چیز تم لیکر آئے ہو ہم اسکا
بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا	انکار کرتے ہیں۔ اور کہا ہم مال و
نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَ	اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور
أَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ	ہم پر عذاب نہیں ہونے کا۔

بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ ....

سورۂ قصص میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کا قول بیان ہوا ہے۔

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا — کہا دو جادوگر ہیں جنھوں نے

وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ — آپس میں ایکا کرلیا ہے اور

كٰفِرُوْنَ ۝ — کہا ہم ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔

سورۂ زخرف میں انہی مترفین کا حال بیان ہوا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ — اور جب ان کے پاس حق آیا

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ — انھوں نے کہا یہ جادو ہے اور

وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ — ہم اسکے منکر ہیں۔

اسی سورہ میں فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا — اور ایسے ہی ہم نے نہیں بھیجا،

مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ — کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنیوالا

مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ — مگر وہاں کے دولتمندوں نے

مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ — کہا کہ ہمنے اپنے باپ دادا کو ایک

اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا — طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے

عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ — نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ — پیغمبر نے کہا کیا اگر میں اس سے زیادہ

بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ — ہدایت کی چیز لاؤں جس پر تم نے

عَلَیْہِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا — اپنے باپ دادا کو پایا ہے بولے

اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ — جو چیز تم لیکر آئے ہو ہم اس کے

كٰفِرُوْنَ ۝ — منکر ہیں۔

یعنی چاہے وہ ہمارے طریقہ سے زیادہ ہدایت بخش ہو یا کم، ہم اپنے باپ دادا کے رستہ سے نہیں ہٹ سکتے۔ اور جو کچھ تم لے آئے ہو ہم کو اس سے علانیہ انکار ہے۔

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ لفظ "کافرون" سے خطاب کا مقصود شتم نہیں ہے، جیسا کہ امام رازیؒ نے سمجھا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ انکار و سرکشی کی اس حد کو پہنچ گئے کہ سچائی کی ایک بات بھی سننے کی تاب نہیں رکھتے، ان سے ایمان و ہدایت کی توقع کا خاتمہ ہو چکا۔ اب ان کے لئے صرف ایک ہی چیز باقی رہ گئی کہ عذاب ہی نمودار ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ سرکشوں کا حال ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔ انھوں نے اپنی رعایا کے حقوق اس وقت تک تسلیم نہیں کئے جب تک تلوار نے

ان کو مجبور نہیں کر دیا۔ اسلئے انبیاء کی سنت ایسے سرکشوں کے معاملہ میں یہ رہی ہے کہ اتمام حجت کے بعد، جب ان سے مایوس ہو گئے اور توبہ و انابت کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی، ان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ خروج کی صورت میں، جیسا کہ ہم اپنی کتاب ملکوت اللہ میں مفصل لکھ چکے ہیں، نظام معاشرت کی بربادی ہے۔ اسلئے انبیاء کرام نے تبری و علیحدگی کی روش اختیار فرمائی۔ قرآن مجید اور کتب مقدسہ میں اس کے شواہد بکثرت ہیں۔ مثلاً فرمایا۔

فَاَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰی	پس جو ہمارے ذکر سے پھر گیا
عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ	اور صرف دنیا ہی کی زندگی پر
اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	قانع ہو گیا اس سے اعراض
ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ	کرو۔ انکے علم کی رسائی یہیں تک
الْعِلْمِ ط	ہے۔

آیات (۲-۳) اعلان برأت میں

م۔ تمدن کے قدیم دور میں، قوموں کے تمام اجتماعی رشتے محض انکے بتوں کی بدولت قائم ہوتے تھے۔ مختلف قبائل مختلف بتوں کی پوجا کرتے تھے

اور جب ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کے ساتھ رشتۂ اتحاد قائم کرنا چاہتا، تو اس قبیلہ کے بت کی پرستش شروع کر دیتا۔ اس طرح جس سلطنت کے زیرسایہ جتنی قومیں ہوتی تھیں، اتنے ہی اسکے اصنام ہوتے تھے۔ قدیم زمانہ میں یہی دستور تھا۔ قومی مصالح میں سب سے زیادہ اہم حیثیت بت پرستی کو حاصل تھی۔ اجتماع واتحاد کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم تھی۔ اسلئے اس میں جس قدر توسیع ہو وہ عین مطلوب تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت جہاں بیان ہوئی ہے وہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ	تم تو اللہ کے سوا یہی تھان بناتے
مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا	ہو، آپس کی دوستی کیلئے دنیا کی
مَّوَدَّةَ بَیْنِکُمْ فِی الْحَیٰوةِ	زندگی میں، پھر قیامت کے دن
الدُّنْیَا ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ	تم میں سے بعض، بعض کا انکار کریگا
یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ	اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا
وَّیَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا	اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا اور
وَّمَاْوٰىکُمُ النَّارُ وَمَا	تمہارے لئے کوئی مددگاروں
لَکُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۵	میں سے نہ ہوگا۔

۔دم اور ہندوستان کی بت پرست قوموں کی تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے اسلئے

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ — نہ میں پوجتا ہوں جسے تم پوجتے ہو

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ — اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں۔

کا اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں ہے۔ یہ آپس کے تمام اجتماعی رشتوں کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم تم سے علیحدہ ہیں اور تم ہم سے علیحدہ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا اعلان اسی قسم کا تھا۔ (فصل ۵ میں الف، ب، ج دیکھو)۔

حسن موقع کے لحاظ سے "تَعْبُدُوْنَ" کی جگہ "اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ" فرمایا لیکن "لَآ اَعْبُدُ" کا قرینہ دلیل ہے کہ یہ حال کے مفہوم میں ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے ایسا ہی سمجھا ہے۔

آیات (۴-۵) تاکید براءت ہیں

۹۔ بلاغت کا تقاضا ہے کہ اعلان براءت نہایت واضح اور موکد لفظوں

میں ہوا اور یہ بلاغت قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس میں تکرار محض نہیں ہے۔ وہ ہر تکرار کے ساتھ کسی جدید فائدہ کا اضافہ کر دیتا ہے قصص و واقعات کے بیان میں اسکے شواہد بکثرت ملیں گے۔ پس لفظ "عٰبِدُوْنَ" مستقبل کی تمام امیدوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اور "عَبَدْتُّمْ" میں ان کے دین آبائی سے بیزاری کا اعلان ہے۔ اور مقابلۃً اس میں زیادہ شدت و غلظت ہے۔ اس کی مثال سورہ انبیاء میں ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ	جب انھوں (ابراہیم) نے اپنے
مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ	باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے
الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ	کہا کہ یہ مورتیں کیا ہیں جنکی پرستش
قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا	پر تم جمے بیٹھے ہو؟ وہ بولے ہمنے انکے
لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ قَالَ	بڑوں کو ان ہی کی پرستش کرتے
لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ	پایا ہے (ابراہیم نے) کہا کہ بیشک
وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ	تم اور تمھارے بڑے صریح گمراہی
مُّبِيْنٍ ۝	میں پڑے رہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ	بھلا دیکھو تو جنکو تم پوجتے رہے ہو،

تَعْبُدُوْنَ ۙ اَنْتُمْ وَ	تم اور تمھارے اگلے آباؤ اجداد۔
اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۙ	بے شک یہ میرے دشمن ہیں۔
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا	مگر اللہ تمام عالم کا پروردگار۔
رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ	....

یعنی نہ ہم تمھارے اور تمھارے آباؤ اجداد کے بتوں کو پوج سکتے اور نہ تم ہمارے خدا کو پوجوگے۔

"کلمہ باقیہ"

۱۰۔ آخری آیت "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِیَ دِيْنِ" خاتمہ کا ایک جامع کلمہ ہے جس نے اپنے اندر، اوپر کی تمام باتیں سمیٹ لی ہیں۔ "لَكُمْ دِيْنُكُمْ" "لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ" کے قائم مقام ہے اور "وَلِیَ دِيْنِ" "وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ" کے برابر ہے اور چونکہ یہ جملہ اسمیہ ہے اسلئے کسی ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تینوں زمانوں پر حاوی ہوگیا ہے۔ اختصار و ایجاز نے اس کو ایک ضرب المثل اور "کلمہ باقیہ" کی شکل میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنِّیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ | بے شک میں بری ہوں ان چیزوں
اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّہٗ | سے جن کو تم پوجتے ہو مگر وہ ذات
سَیَہْدِیْنِ ہ وَجَعَلَہَا | جس نے مجھ کو پیدا کیا بے شک
کَلِمَۃً بَاقِیَۃً فِیْ عَقِبِہٖ | وہ میری رہبری فرمائیگا اللہ نے
لَعَلَّہُمْ یَرْجِعُوْنَ ہ | اسکو ایک باقی رہنے والا کلمہ بنایا اسکے
.... | بعد تاکہ وہ رجوع کریں۔

ہجرت سے پہلے پیغمبروں کی طرف سے اسی قسم کے اعلانات ہوتے ہیں حضرت ہود علیہ السلام نے اعلان فرمایا۔

اِنِّیْ اُشْہِدُ اللّٰہَ وَ | میں خدا کو گواہ کرتا ہوں اور تم
اشْہَدُوْا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ | بھی گواہ رہو کہ خدا کے سوا جو تم دوسرے
مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ | شریک بناتے ہو میں ان سے بالکل
فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا | بیزار ہوں، سب تم سب ملکر میرے
ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ہ | ساتھ اپنا داؤ کر دیکھو اور پھر
(۵۵-ہود) | مجھ کو مہلت نہ دو۔

اسی سنت کے مطابق آنحضرت صلعم کی زبان پر یہ یادگار کلمہ جاری ہوا۔ اور

آپ کی ہجرت کے بعد، ایک دائمی خلش بنکر، ان کے دلوں میں بس گیا۔ اور گو اسکے بعد بھی زبانوں کا انکار باقی رہا لیکن دلوں نے گواہی دیدی کہ آپ کا دین، خدائی دین ہے۔ اپنے زمانہ قیام مکہ میں آپ نے وعدہ وعید کی کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھی۔ نصیحت کے کلمات اور پند و موعظت کے ارشادات سے ان کو اچھی طرح باخبر کردیا اور جب انھوں نے ان باتوں پر کان نہیں دھرا، آپ نے انکو آخری مرتبہ جھجھوڑا اور چھوڑ کر چلے گئے کہ ممکن ہے یہ آخری تدبیر کچھ کارگر ہو اور وہ خدا کی طرف متوجہ ہوں۔ ہجرت کے بعد آپ کی قوم میں سے ایک بڑی جماعت نے آپ کی دعوت قبول کی۔ صرف وہی لوگ انکار پر قائم رہے جن کے لئے عذاب مقدر ہو چکا تھا۔ وہ بالآخر قتل و ہلاک ہوئے۔

اسی اصول کے مطابق آپ نے فتح مکہ کیوقت بھی ایک سخت اور آخری تبلیغ فرمائی۔ یعنی سورۂ برأت اہل مکہ کو سنائی گئی۔ اس اعلان نے اہل عرب کو متوجہ کیا اور ایک بڑی جماعت کو توبہ کی توفیق ہوئی۔ اسی وجہ سے سورہ برأت کو سورۂ توبہ بھی کہتے ہیں۔ اور یہی نکتہ ہے کہ سورۂ کافرون ایک ایسی سورہ کے ساتھ رکھی گئی جس میں توبہ کبریٰ کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل بارہویں فصل میں آئیگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت اور عذاب بھی منجملہ اسباب ہدایت کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (سجدہ)

اور قیامت کے بڑے عذاب سے پہلے ہم ان کو ایک ایسے عذاب کا مزہ بھی ضرور چکھائیں گے جو (اس دنیا میں ان پر) عنقریب نازل ہوگا تاکہ یہ لوگ ہماری طرف رجوع کریں۔

ہجرت کے جنگ و برأت ہونے کا ثبوت احادیث سے

۱۱۔ پانچویں فصل میں، آیات قرآن کی روشنی میں، ہم دکھا چکے ہیں کہ ہجرت، جنگ و برأت کا اعلان ہے۔ اب بعض روایات پر غور کرو جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قریش نے ہجرت کو جنگ کا پیش خیمہ سمجھا اور اسی وقت سے طیاریوں میں لگ گئے۔

ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں ایک روایت لائے ہیں کہ جب انصار کے ۷۰ مرد اور ۲ عورتیں آنحضرت صلعم سے بیعت کے لئے آئے تو قبیلۂ خزرج کے ایک سردار عباس بن عبادہ نے کہا اے معشر خزرج! کچھ خبر ہے۔ ان سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو! لوگوں نے کہا ہاں! بولے ان سے احمر و اسود کی

جنگ پر بیعت کر رہے ہو، پس اگر تم کو خیال ہو کہ جب تمھارے مال پر تباہی آئیگی اور تمھارے سرداروں کو قتل و ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا تو تم ان کو چھوڑ دوگے تو بہتر ہے ابھی سے چھوڑ دو، کیونکہ اگر بیعت کے بعد تم نے ایسا کیا تو خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہوگی۔ الخ

ایک دوسری روایت کعب بن مالک سے مروی ہے، فرمایا، جب صبح ہوئی قریش کے سرداروں کی ایک جماعت ہمارے پاس آئی اور کہا اے معشر خزرج! ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ ان کے پاس (آنحضرت صلعم) اسلئے آئے ہیں کہ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں اور ہم سے لڑائی پر آپ لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں، خدا کی قسم، اگر ان کے اور ہمارے درمیان جنگ چھڑ گئی تو تم سے زیادہ عرب کا کوئی قبیلہ ہمارے نزدیک مبغوض نہ ہوگا۔ الخ

اسی طرح ایک روایت ہے کہ براء بن معرور انصاری آنحضرت صلعم کا ہاتھ پکڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور بیعت کرنا چاہتے تھے [illegible]
کے حلیف تھے، بات کاٹ کر بولے۔ [illegible]
معاہدہ ہے، اب ہم اس کو کاٹ رہے ہیں [illegible]
اللہ غلبہ دے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنی قوم [illegible]

سُن کر مسکرائے اور فرمایا۔ تمھارا خون میرا خون ہے اور تمھارا ہدر میرا ہدر ہای، تم مجھ سے ہو اور میں تم میں سے ہوں، جس سے جنگ کرو گے اس سے جنگ کرونگا جس سے صلح کرو گے اس سے صلح کروں گا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ہجرت درحقیقت تمام کفار و مشرکین اور یہود سے جنگ تھی۔ اس دن ایک نئی امت ظہور میں آگئی اور آنحضرت صلعم کو ایک مستقر اور ایک چھوٹی سی جماعت تائید و رفاقت کے [illegible] ہو گئی یعنی ایک حد تک وہ شرائط پورے ہو گئے جنکے بغیر جنگ ناجائز ہے [illegible] ہماری کتاب الہجرۃ والحرب دیکھو) لیکن اسکے باوجود بھی آنحضرت صلعم مکہ میں مقیم رہے اور اعداء کی تمام ایذا رسانیاں جھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے آپکے قتل کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت ہجرت کی شرط پوری ہو گئی اور قوموں کا انبیاء کے ساتھ ہمیشہ جو معاملہ رہا ہے وہ ظاہر ہو گیا۔ فصل (۱) و (۲) میں پڑھ چکے ہو کہ نبی کو صبر اور تحمل شدائد کا حکم ہے۔ یہاں تک کہ معاملہ بالکل آخری حد کو پہنچ جائے۔ اس وقت پیغمبر ہجرت فرماتا ہے۔ "ہجرت فرماتا ہے" بھاگتا نہیں۔ پہلے برأت کا اعلان کرتا ہے۔ اپنے شیرازہ کو مجتمع کرتا ہے۔ خدا کی مدد کے بھروسہ پر پوری طرح مطمئن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ایک وقت متعین ہو جاتا ہے، وہ اس طرح بے خوف و خطر روانہ ہو جاتا ہے گویا دنیا کی کوئی قوت اس کو گزند نہیں پہنچا سکتی۔ ان اشارات کو ہم پوری تفصیل کے ساتھ کتاب الہجرۃ میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ انبیاء کا اپنی قوم کو چھوڑ کر چلا جانا فرار نہیں ہے بلکہ ہجرت و برأت تمام انبیاء کی سنت رہی ہے۔

سورہ کا تعلق مابعد سے

۱۲- چونکہ یہ سورہ جنگ کی سورہ تھی اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسکے ساتھ سورۃ النصر کو رکھا کہ یہ واضح ہوسکے کہ جنگ اور فتح دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ قرآن مجید میں ان دونوں کے ربط کی مثالیں بہت ہیں۔ چوتھی فصل میں بعض اشارات گذر چکے ہیں۔ اس سلوب کو اسلوب القرآن کی بحث وصل میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ اس فتح و غلبہ کا اصل مقصود یہ تھا کہ مسجد حرام صرف خدائے واحد کی طاعت و عبادت کا مرکز بنجائے اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو کر اپنے حقیقی رب سے وابستہ ہو جائے۔ اس اصولی حقیقت کو یاد رکھو۔ اس سے بعض اہم مباحث کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ ہجرت دراصل وصل کا دیباچہ اور جنگ درحقیقت صلح اور توبہ کا پیش خیمہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کی بعثت ، ذریت ابراہیم علیہ السلام کیلئے سراپا خیر و برکت تھی۔ عذاب اور نقمت نہ تھی۔ اس پر ایک اجمالی بحث سورہ یوسف کی تفسیر میں بھی ملے گی۔ ھذا واللہ تعالی اعلم فان اصبت فلہ المنۃ وان اخطأت فارجو العفو ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطأنا۔

